آدھا آسمان

رئیس فاطمہ

آدھا آسمان

(کہانیاں)

رئیس فاطمہ

نوبہار پبلی کیشنز کراچی
فون نمبر: 4652612-6314027

کتاب : آدھا آسمان

مصنفہ : رئیس فاطمہ

سالِ اشاعت : ۲۰۰۵ء (پہلی بار)

تعداد : پانچ سو

کمپوزنگ : غزالی پرنٹرز ناظم آباد کراچی

طابع : ذکی سنز پرنٹرز

قیمت : 170/-

ناشر : نوبہار پبلی کیشنز کراچی

ٹیلی فون نمبر برائے رابطہ: 6314027-4652612

4642887

انتساب

برِ صغیر کے عالمِ بے بدل
اور اپنے قابلِ احترام سُسر

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (مرحوم) کے نام

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں؟

دنیا پر پھیلے ہوئے نیلے آسمان کا
آدھا حصہ عورتوں نے اٹھا رکھا ہے
(ایک مشہور چینی کہاوت)

فہرست

پیش لفظ — رئیس فاطمہ

دیباچہ — حمید اختر

رئیس فاطمہ — ایک پختہ کار اور مستند افسانہ نگار: ڈاکٹر آغا سہیل

بیانیہ اسلوب کی کہانی — ادیب سہیل

کہانیاں

۱	فصلِ گل کا ماتم	۱
۲	رینا عبدالکریم	۱۴
۳	کیکٹس	۲۰
۴	بیوٹی پارلر	۳۳
۵	آئینہ	۵۱
۶	پُل صراط	۶۴
۷	خواب، سراب	۷۳
۸	شہر کو سیلاب لے گیا	۱۰۴

پیش لفظ

رئیس فاطمہ

میری کہانیوں کا چوتھا مجموعہ آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ اس سے قبل میری کہانیوں کے تین مجموعے ''گلاب زخموں کے'' ''شاخِ نہالِ غم'' اور ''موسم، اداسیوں کے'' شائع ہو چکے ہیں۔ پڑھنے والوں کی جانب سے ان تینوں مجموعوں کی جو پذیرائی ہوئی اور جس طرح انہوں نے اپنی پسند کا اظہار مجھ سے کیا اس نے میری بے حد حوصلہ افزائی کی۔ یہ اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ میرا چوتھا مجموعہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اپنے قارئین کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی اور ادبی فریضہ ہے۔ امید ہے موجودہ مجموعے کو بھی اسی طرح پسند کیا جائے گا۔ اب چند معروضات اپنی ان کہانیوں کے حوالے سے!

جب میں نے ہوش سنبھالا اور شعور کی آنکھ کھولی تو کہانی اور افسانے کی صنف میں چار بڑے نام کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹواور عصمت چغتائی، آسمانِ ادب پر کہکشاں کی مانند روشن تھے۔ میں نے انہی تخلیق کاروں کی کہانیوں کے مطالعے سے فیضان حاصل کیا ہے اور انہی کے انداز، اسلوب، طرزِ احساس اور طرزِ ادا کی رہنمائی میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں اور یہ سراسر میرا ذاتی

خیال ہے کہ نصف صدی کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اردو کہانی ان بڑے اور اہم افسانہ نگاروں، اور کہانی کاروں کے براہِ راست بیانیہ طرزِ اظہار کے مخصوص سانچوں اور دائروں سے باہر نکل کر اپنی پذیرائی اور قدر و قیمت سے محروم ہو چکی ہے جس کا منفی نتیجہ ہمارے سامنے یوں آیا ہے کہ اردو کہانی کا قاری بھی تجرید، اساطیر اور علامتوں کے گنجلک جنگل اور دھندلکوں میں کہیں گم ہو چلا ہے جسے واپس لانا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں حقیقت تو یہی ہے کہ گزشتہ تین چار عشروں کے دوران نہ ہماری نظر سے اردو کی کوئی بڑی اور اہم کہانی گذری ہے، نہ کوئی بڑا اہم اور ممتاز علامتی / اساطیری یا تجریدی افسانہ نگار نئی کہانی کی علامتی تحریک نے پیدا کر کے دکھایا ہے۔ چونکہ اردو میں علامتی اور تجریدی کہانیوں کو اس کے قاری کی جانب سے قطعاً کوئی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی لہٰذا اس تحریک کو کوئی بڑا نقاد بھی میسّر نہ آسکا جو اس تحریک کے بارے میں قارئین کو قائل کر سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج کا قاری اردو کے ان افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں ہی سے واقف ہے جن کے نام میں نے اوپر درج کیے ہیں اس کے بعد خانہ خالی ہے۔کیا کبھی آپ نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ ''کپرا بابا'' ''لاجونتی'' ''ہتک'' ''بابو گوپی ناتھ'' ''چوتھی کا جوڑا'' ''بالکونی'' ''مہالکشمی کا پل'' ''ان داتا'' نظارہ درمیاں'' ہے۔جیسے شاہکار افسانے اب وجود میں کیوں نہیں آتے؟ اس معیاری سطح اور تخلیقی کمال کو پہنچی ہوئی کہانیاں گذشتہ کئی عشروں سے کیوں نہیں لکھی جارہی ہیں؟

واقعہ کیا ہے؟ واقعہ دراصل یہ ہے کہ کہانی (واضح رہے کہ مختصر افسانہ یا شارٹ اسٹوری، مغرب سے درآمد کردہ اصطلاح ہے جس کا اطلاق ہمارے ہاں لکھی جانے والی کہانیوں پر کیا جاتا ہے۔) برِصغیر کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا ایک ثقافتی، اظہاریہ ہونے کے ناتے ہمارے اجتماعی لاشعور کا ایک لازمی جزو بن چکی ہے اور آپ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ جب تک آپ کے کلچر میں کسی بھی ادبی صنف کی تخلیقی جڑیں، گہرائی اور گیرائی میں موجود نہ ہوں گی اس صنف کو آپ کا معاشرہ کبھی

قبول نہیں کرے گا!

اس کی مثال کے لیے میں یہاں ہائیکو کا حوالہ دینا چاہوں گی جس کی تخلیقی جڑیں صدیوں سے جاپان کے مخصوص معاشرے میں گہرائی تک اتری ہوئی ہیں چنانچہ یہ صنف پاکستانی معاشرے کے لیے ہمیشہ اجنبی اور نامانوس ہی رہے گی کیونکہ ہمارے معاشرے میں ہائیکو جیسی کوئی صنف کسی بھی شکل میں پہلے کبھی موجود نہیں رہی۔ یہی سبب ہے کہ اردو کہانی میں ، کہانی کی واپسی کے موضوع پر ہر جگہ گفتگو ہو رہی ہے اور متعدد لکھنے والے اب کہانی کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

واضح ہو کہ میں ذاتی طور پر علامت پسندی اور علامت نگاری کے خلاف ہرگز نہیں ہوں۔ اردو غزل نے بھی اسی برصغیر کے معاشرے کی مخصوص صورتِ حال سے جنم لیا ہے اور بقولِ غالب اس میں ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو' بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر تو آپ دیکھئے کہ شعر و سخن کی حد تک غزل آپ کے ہاں بنیادی طور پر ایک علامتی صنف رہی ہے جسے آج بھی دونوں ملکوں کے معاشرے میں غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہے۔ غزل میں صدیوں سے جو علامتیں استعمال ہوتی چلی آ رہی ہیں ان کا ایک خاص مفہوم اور مطلب ہے جس سے غزل کا قاری بخوبی آشنا ہے۔ ہاں یہ بات ہمارے ناقدین اور دانشوروں کے سوچنے کی ہے کہ غزل میں تو علامتوں کو جوں کا توں قبول کر لیا گیا بلکہ ان کے استعمال سے شاعری کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے لیکن کہانیوں میں علامتی طرز اظہار کو مسترد کر دیا گیا تو آخر اس کے اسباب اور وجوہ کیا ہیں؟ ہم اردو غزل میں، علامتوں کو سمجھ کر ان سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں لیکن کسی کہانی میں استعمال کی گئی علامتیں ہماری عقل اور فہم سے بالاتر ہوتی ہیں۔ امید ہے میری رائے سے اختلاف رکھنے والے کم از کم اس نکتے پر ضرور غور و خوض فرمانے کی زحمت کریں گے۔

دیباچہ

پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں میں فی زمانہ ایسے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں جو صلہ و ستائش کی تمنا کیے بغیر خاموشی سے تخلیقی عمل میں مصروف ہوں اور یوں سچے قلم کار کی ذمہ داریاں پوری کرنے پر مطمئن ہوں۔ خاتون افسانہ نگار رئیس فاطمہ کا شمار بلاشبہ ان معدودے چند لکھنے والوں میں کیا جاسکتا ہے جو کسی ادبی دھڑے بندی میں شامل ہیں اور نہ اپنی صفت و ثناء کے لیے کسی حلقے کی محتاج۔ ان کی ساری توجہ تخلیقی عمل پر مرکوز ہے۔ انھوں نے اردو کے بہت سے معروف افسانہ نگاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھی لکھا ہے اور ان کی تحریریں معیاری بھی ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے سے قبل ان کے افسانوں کے تین مجموعے اور دو ناولٹ شائع ہو چکے ہیں۔

ہمارے لیے یہ امر البتہ حیرت کا باعث ہے کہ اتنا بھرپور کام کرنے کے باوجود انھیں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں وہ شناخت نہیں ملی جس کی وہ مستحق ہیں، ہر سال کے اختتام پر شائع ہونے والے ادبی جائزوں میں بھی

ان کا نام کم کم ہی نظر آیا ہے، ادب کے نقادوں کے تبصروں میں بھی ان کا ذکر نہیں ملتا، ممکن ہے اس میں ہماری کوتاہی کا دخل بھی ہو تاہم جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے ہم نے نقادانِ ادب کے تبصروں میں ان کا نام شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ اس کی وجہ وہی ہوسکتی ہے جس کی طرف ہم اس تحریر کے آغاز میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی چونکہ وہ ادبی گروہ بندیوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے صرف تخلیقی عمل میں مصروف رہتی ہیں اس لیے اس توجہ سے محروم ہیں جو ان کا حق ہے۔ ان کی کہانیاں یقیناً اس قابل ہیں جو ادب کے نقاد کو متوجہ کریں۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل ان کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس کی زندگی اور جہد للبقا میں مصروف اس زندگی کے جزو کرداروں کے رویوں پر کتنی گہری نظر رکھتی ہیں، ایسے کردار ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں دیکھنے اور ان کے دُکھ سکھ کا اندازہ لگانے کے لیے جو گہری نظر اور مشاہدے کی قدرت درکار ہوتی ہے رئیس فاطمہ میں وہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ موجودہ زمانے میں جب پیسہ کمانے اور معاشرے میں اپنا مقام و مرتبہ بلند کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے، رینا عبدالکریم اور بیوٹی پارلر چلانے والی یاسمین حسن جیسی خواتین بڑے شہروں کے ہر گلی محلے میں موجود ہیں مگر انھیں کہانی کا موضوع بنانا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اس کوشش میں وہی لکھنے والا کامیاب ہوسکتا ہے جسے کہانی کہنے کا فن آتا ہو، رئیس فاطمہ اس فن کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

رئیس فاطمہ کی کہانیوں میں بالعموم اور زیرِ نظر مجموعے میں بالخصوص اس معاشرے میں عورتوں پر روا رکھے جانے والے مظالم کی شکار خواتین ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، تاہم سماجی مرتبے، بہتر تعلیم یا اس کھوکھلے معاشرے

میں اونچا مقام حاصل کرنے والی ان خواتین کو بھی مصنفہ نے معاف نہیں کیا
جو غریب اور ان پڑھ رشتے داروں سے متنفر ہو کر ان کی ہی نہیں اپنی زندگی
بھی اجیرن بنا دیتی ہیں۔ اس کی ایک خوب صورت مثال مجموعے میں شامل
کہانی ''کیکٹس'' ہے۔ رئیس فاطمہ اپنے گرد و پیش میں بسنے والے کرداروں
اور سماجی مسائل کا ادراک کرنے اور انھیں موزوں اور مناسب الفاظ میں
پڑھنے والوں کو پیش کرنے کی حیرت انگیز قدرت رکھتی ہیں۔ وہ کہانی کے آغاز
ہی میں پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں جس کے بعد قاری اس
کے خاتمے تک اپنی توجہ نہیں ہٹا سکتا۔ وہ انسانوں ہی کے نہیں شہروں کے
المیوں کا بیان بھی بڑی چابک دستی سے کرتی ہیں۔ گزشتہ بیس پچیس برس میں
پاکستان کے بڑے شہروں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اور ان کی وجہ سے ان میں
بسنے والوں کے رویے جس طرح بدلے ہیں اس کی نمایاں عکاسی ان کی کہانی
''شہر کو سیلاب لے گیا'' میں کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے کراچی جیسے شہر
کے مزاج میں تیزی سے ہونے والی سماجی تبدیلیوں اور شہریوں کے بدلتے
ہوئے طور طریقوں کی بڑی چابک دستی سے نشان دہی کی ہے۔ اس شہر میں
بیس برسوں کے دوران جس طرح کتابوں کی دُکانوں کی جگہ فاسٹ فوڈ کے
نئے مراکز قائم ہوئے ہیں اور یوں اس کی ہئیت ہی بدل گئی ہے۔ پڑھنے
والوں کے لیے اس بارے میں غور و فکر کرنے کے بہت سے دروا ہو گئے ہیں۔

رئیس فاطمہ کے افسانوں کی جو سب سے بڑی خوبی ہمیں نظر آئی وہ
یہ ہے کہ وہ سیدھی سادھی، عام فہم اور شستہ زبان میں روایتی کہانیاں لکھتی
ہیں۔ ان کی تحریر میں الجھاؤ ہے نہ لفاظی۔ جدید افسانے میں ''کہانی'' کا جو
عنصر غائب ہو گیا تھا مصنفہ نے اس کو واپس لانے میں قابلِ قدر کام کیا ہے،

ان کے افسانے کہانی کے پورے لوازمات سے آراستہ ہیں۔ وہ مفروضوں اور جذباتیت سے دور رہتے ہوئے اپنے آس پاس کے سماجی حالات اور ان حالات کی زد میں آئے ہوئے کرداروں کی نفسیات کا بیان بڑی خوب صورتی سے کرتی ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس سے آج کے اکثر کہانی کار محروم نظر آتے ہیں۔

حمید اختر

لاہور ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۴ء

"رئیس فاطمہ: ایک پختہ کار اور مستند افسانہ نگار"

ڈاکٹر آغا سہیل

تخلیق بجائے خود تعمیر فکر کی رہین منت ہوتی ہے اور تعمیر فکر اپنے عمرانی اور معاشرتی ماحول سے مرحلہ وار گزرتی رہتی ہے اور اس کی تشکیل پذیری ہمہ جہات ہوتی رہتی ہے، رئیس فاطمہ اگرچہ تخلیق فن میں ایک پختہ کار اور مستند افسانہ نگار ہیں اور اب تک ان کے تین عدد مجموعے معرض وجود میں اور معرض شہود پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں مگر یہ ایک المیہ ہے کہ کراچی (سندھ) کے پختہ کار فن کاروں کا پنجاب سے بھرپور تعارف نہیں ہوتا، رئیس فاطمہ تو اردو کے ایک مقبول عام روزنامے میں صحافت سے بھی وابستہ رہی ہیں، درس و تدریس کے اعلیٰ اور جلیل القدر عہدوں پر فائز رہی ہیں اور شعر و ادب کی تخلیق کے ایک ایسے خانوادے کی تربیت یافتہ ہیں جس کا برصغیر کی علمی ادبی اور سیاسی تاریخ میں ایک ممتاز اور قابل لحاظ مقام ہے، تاہم ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں خاکساری اور انکساری کا جوہر بھی شامل ہے، رئیس فاطمہ فکشن سے غیر معمولی شغف کے فطری رجحان کی بنا پر روس اور فرانس کے ممتاز افسانہ نگاروں کے سکہ بند تخلیقی کارناموں سے بطور خاص دلچسپی رکھتی تھیں اور یہ ان کی خوش بختی ہے کہ اسی

دورانیے میں اردو کے ایک مستند افسانہ نگار اور نقاد پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھ پوری کی رہبری ان کو میسر آگئی۔ مجنوں خود روس اور فرانس کے فکشن نگاروں کی نگارشات سے ذہنی قربت اور مطابقت رکھتے اور دونوں متذکرہ ممالک کے انقلابات کے پس منظر میں تاریخ کے مادّی جدلیاتی نقطہ نظر کا مطالعہ کر چکے تھے اور اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ تاریخ کے ہمہ گیر محرکات اور عوامل عمرانی، معاشرتی اور معاشی حالات کو کس کس طرح متاثر کرتے ہیں اور ان کے اثرات کس قدر وقیع اور دیرپا ہوتے ہیں جو بسا اوقات سفر کرتے رہتے ہیں اور مستقبل کے اداروں میں نمودار ہو کر اخلاقی اقدار کا تعین کرتے ہیں، برصغیر کے مختلف خطوں صوبوں اور شہروں سے ہجرت کرنے والی آبادیوں کا المیہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ یہ آبادیاں اپنے ساتھ بے شک زمین کا کوئی ٹکڑا لے کر نہیں آئی تھیں اور نہ یہاں سے ہجرت کر کے دوسری جگہ جانے والے اپنے ساتھ زمین کا کوئی ٹکڑا لے کر گئے تھے بلکہ صدیوں اور قرنوں کی وہ سائیکی ان کے ہمراہ تھی جس میں عمرانیات، معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی اقدار کی اخلاقی اور لسانی روایات سانس لیتی تھیں کہ یہ بستیاں ذی روح انسانوں کی تھیں اور جہاں جہاں وہ پہنچے تھے انتہائی نامساعد حالات سے دوچار رہنے کے بعد اور نئی سرزمینوں کے تمدنوں اور دیرینہ تہذیبوں کی روایات سے سمجھوتہ کرنے میں ان کو برسوں لگے کہ بہرحال سرزمینوں کے تقاضے تغیر پذیر رہتے ہیں اور اذہان ایک رات میں نہیں بدلتے، جمنا کنارے جنم لینے والی رئیس فاطمہ کو سندھو ندی کے باسیوں کی دیرینہ اور کہنہ سال تہذیبی لسانی ثقافتی اقدار کی نسبت (خواہ وہ کتنی ہی پرثروت اور وقیع ماضی کیوں نہ رکھتی ہوں برصغیر کی قوی، پرجمال تہذیبی اقدار میں زیادہ ترقی یافتہ شعور کار فرما دکھائی دیا اور دوسرا المیہ یہ ہوا کہ سندھ میں مضافاتی علاقوں پر چونکہ جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کا کلچر حاوی تھا جس کی نمو پذیری تقریباً ختم ہو چکی تھی اور بوجوہ اس کلچر میں تھیوروکریسی کا عنصر غالب تھا جس نے تصوف (جو تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن سے عبارت ہوتا ہے) کے نام پر عوام الناس اور جملہ جمہوری اداروں کو اپنے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ بنا کر عوام کے اذہان کو ارتقاء

کے فطری اور قدرتی راستے پر چلنے سے روک رکھا تھا اور مہاجرین کی معتد بہ تعداد شہروں سے آکر شہروں میں بسی تو ان کا ترقی یافتہ شعور ترقیِ معکوس سے متصادم رہا، رئیس فاطمہ کے رہبر مجنوں تھے جو تاریخ کا مادی جدلیاتی تناظر میں تجزیہ کر چکے تھے جس کے نتیجے میں فرد اور معاشرے کا رابطہ زیادہ سائنٹفک تھا جس نے سوشل سائینسوں کی ترویج و اشاعت کی تھی لہٰذا رئیس فاطمہ (اگرچہ مجنوں صاحب کو مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے پر یقین رکھتی تھیں) لیکن شعوری اور لاشعوری طور پر وہ مجنوں صاحب کی تعلیمات سے بہر حال متاثر تھیں، مزید براں رئیس فاطمہ خود بھی تدریس کے پیشے سے وابستہ رہیں جہاں معاشرے کی تاریخی، معاشی، معاشرتی تہذیبوں اور پس منظر سے آنے والے طلبہ و طالبات کے جملہ اقدار کے مضمرات نے تواتر اور تسلسل کے ساتھ انھیں متاثر کیا، اس فضا اور ماحول میں تخلیقی اور حساس ذہن جو مواد فراہم کرتا رہتا ہے وہی تخلیقی محرکات اور عوامل بھی فراہم کرتا رہتا ہے، ان حالات میں رئیس فاطمہ اگر فکشن سے رجوع نہ ہوتیں تو اپنے تخلیقی نمو پذیری کے فن سے اغماض کرتی رہتیں، تین مجموعوں کے بعد ان کا ارتقائی سفر بدستور اپنی قوت نامیہ سے مضمحل ہوکر اور تھک کر راستے میں بیٹھ نہیں رہا۔ رئیس فاطمہ (ایک فرد کی حیثیت سے بھی اجتماعی شعور کے لحاظ سے بھی) ایک متمول اور فعال ادیبہ ہیں، چوتھا مجموعہ (افسانوں) کا ''آدھا آسمان'' کے عنوان سے معرض وجود میں آچکا ہے اور معرض شہود پر نمودار ہو رہا ہے، جو ادب کی عصری حسیت سے سرشار بھی ہے اور پروقار بھی ہے، یقین ہے اسے بھی ارباب فکر و دانش پذیرائی بخشیں گے۔

بیانیہ اسلوب کی کہانی

ادیب سہیل

رئیس فاطمہ کی افسانہ طرازی کا پسندیدہ اُسلوب بیانیہ ہے۔ اُس وقت بھی جب اُردو فکشن میں ساٹھ کی دہائیوں سے ایمائیت، علامت، تجرید اور آ کہانی (Anti Story) کے تجربات کی گرد اُڑائی جارہی تھی اور کہانی کاروں کا ایک بڑا طبقہ اس جانب بے تحاشا بھاگ رہا تھا اور اُس وقت بھی جب اسّی کی دہائیوں میں وہی فکشن نگار قاری کی گمشدگی کا واویلا کررہے تھے، اور قاری کی گمشدگی کے اسباب تلاش کرنے کے لیے پٹنہ اور دہلی میں سیمینار منعقد کررہے تھے جن میں بالآخر یہ طے پایا کہ قارئین کو واپس لانے کے لیے کہانی میں کہانی پن کو واپس لانا ہوگا۔ کہانی پن کے ساتھ بیانہ جُڑا ہوتا ہے، لہٰذا بیانیہ اسلوب کو واپس لانا لابدی ہے۔

افسانہ طرازی کے اِن مختلف مدارج میں رئیس فاطمہ اپنے بیانیہ طرزِ اظہار پر ثابت قدم رہیں۔ بیانیہ کا یہ طرزِ اظہار رئیس فاطمہ کے طویل افسانے ''شاخِ نہالِ غم'' میں پوری آب و تاب کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔

رئیس فاطمہ کل بھی بیانیہ طرزِ اظہار کی طرف دار تھیں، آج بھی یہ اُن کا پسندیدہ اسلوب ہے، اس اظہار کی رنگا رنگ صورتیں ان کے تازہ افسانوی مجموعے ''آدھا آسمان'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ابھی اوپر میں نے علامتی طرزِ نگارش اور کہانی پن کے حوالے سے دونوں کے بہم رواں ہونے کے نتیجے میں ایک امتزاجی صورت نمایاں ہونے کی بات کی ہے، یہ صورت ذہین افسانہ نگاروں کو اپنی جانب ملتفت ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

''فصلِ گُل کا ماتم''

حویلی میں سناٹا طاری تھا' زمیندار امیر علی چوڑے چکلے خوبصورت بیڈ پر نیم دراز تھا جس کے سرہانے صندل کی لکڑی کا خوبصورت کام مہک رہا تھا، اس کے چہرے سے پریشانی اور دکھ صاف عیاں تھے۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیہ بھگو رہے تھے' وہ خیالوں میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا...... ''یہ کیا ہو گیا میرے مولا؟ میں تو اولاد کی دعا مانگنے حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر جا رہا تھا...... لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں باپ بننے سے محروم ہو گیا'' ...... امیر علی نے دکھ سے سوچا' وہ اس وقت ایک ظالم زمیندار نہیں بلکہ ایک مظلوم اور لاچار انسان لگ رہا تھا جس نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو پہچانا تھا...... عجیب بات یہ تھی کہ اس کار ایکسیڈنٹ میں اس کی تیسری بیوی سکینہ کو زیادہ چوٹ نہ آئی تھی، مسلسل تین شادیاں کرنے کے بعد بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا' جبکہ خرابی نہ اس میں تھی نہ اس کی بیویوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو اس نے آزما لیا بالآخر مایوس ہو کر اس نے درگاہوں پر جانا شروع کر دیا تھا اسی سلسلے میں وہ سکینہ کے ساتھ' اپنی گاڑی میں کراچی آ رہا تھا کہ کلفٹن کے پل پر اس کی گاڑی کی ٹکر ایک ٹرک سے ہو گئی، ٹرک نے اسی طرف سائیڈ ماری تھی جدھر امیر علی بیٹھا تھا، گاڑی بالکل چکنا چور ہو گئی تھی' ڈرائیور بھی خاصا زخمی ہوا تھا لیکن سکینہ دروازہ کھل جانے کی وجہ سے باہر جا گری تھی اور محفوظ رہی تھی اسے بہت ہی معمولی چوٹیں آئی تھیں امیر علی کا زندہ بچ جانا ہی معجزے سے کم نہ تھا مگر جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ کچھ اندرونی چوٹیں ایسی آئی ہیں جن کی وجہ سے وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے تو اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں اسے اس

وقت ریشماں یاد آ گئی' دینو کمہار کی خوبصورت اور الہڑ بیٹی جو اس کی لچھے دار باتوں کو پیار سمجھ بیٹھی اور اپنا کورا پنڈا، اس کے حوالے کر دیا۔ امیر علی تو ایک منہ زور گھوڑا تھا جس کی لگا میں کسنے کے لئے اس کی ماں اور دادی موجود تھیں' اور گاہے گاہے بڑی اور چھوٹی' چوہدرانی اس کے کمرے میں حویلی کے پروردہ کمی کاریوں کی جوان بیٹیوں کو ناشتے، دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے لے کر بڑے اہتمام سے بھیجا کرتی تھیں اور جب وہ اندر سے واپس آتی تھیں تو بڑی چوہدارنی یعنی امیر علی کی دادی کے حکم سے انہیں کئی دن تک اجوائن' گڑ اور چھوہارے پکا کر پلائے جاتے تھے' لیکن ریشماں کے معاملے میں کسی کو کچھ بھی نہ پتہ چلا۔ دینو کمہار دن بھر برتن بناتا رہتا اور ریشماں سارے گاؤں میں گھومتی رہتی' اسے ہر کوئی پیار کرتا' اس کی نیلی نیلی آنکھیں اور بھورے بال' بالکل اس کی مرحومہ ماں کی طرح تھے جو اسے دس برس کا چھوڑ کر مر گئی' دینو نے اپنی پیاری بیٹی کی وجہ سے دوسرا نکاح بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اب اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی' گاؤں کے اسکول میں اس نے آٹھویں جماعت تک پڑھا تھا اور آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہ تھا۔ دینو کسی اچھے سے بر کی راہ تک رہا تھا کہ ایک دن امیر علی نے کھیتوں میں اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ ہیر رانجھا کا یہ کھیل امیر علی بڑی مہارت سے کھیلتا رہا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ وہی اس کی دلہن بنے گی پھر ایک دن ریشماں کو اپنے وجود میں کسی دوسرے وجود کی دھڑکن سنائی دی، وہ پریشان ہو گئی' اس نے اپنی اس مشکل کا ذکر جب امیر علی سے کیا اور اسے شادی کا وعدہ یاد دلایا تو اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا اور کہا وہ کسی اور کا گناہ اس کے سر منڈھ رہی ہے یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور لوگوں کو پتہ چل گیا، دینو نے بیٹی کو دھنک ڈالا، اس نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ امیر علی نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا' پھر وہ ایک دن موقع پا کر حویلی پہنچ گئی اور بڑی چوہدرانی کے قدموں میں گر کر ڈبڈبائی آنکھوں سے بولی:-

''چوہدرانی جی اللہ میاں کہتا ہے کہ وہ سچ بولنے والوں کے ساتھ ہے۔ آپ میری بات کا یقین کرو میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں آپ کے پوتے کے بچے کی ماں بننے والی ہوں اس نے مسجد کے ساتھ کھڑے ہو کر میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی تھی کہ وہ مجھ سے ہی بیاہ کرے گا''

بڑی چوہدرانی نے نوکر کو اشارہ کیا وہ ریشماں کو گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا کہ اسی اثناء میں امیر علی کہیں حویلی کے اندر سے آ نکلا' اور اچانک اس نے تیزاب کی بھری بوتل ریشماں کی طرف پھینکی جس کے پھٹنے سے اس کا تیزاب نکل کر ریشماں کے جسم کے مختلف حصوں کو جلا گیا ،ملازم نے آناً فاناً' اسے دروازے سے باہر پھینکا اور خود ایک کونے میں دبک گیا' تیزاب کی اذیت نے ریشماں کی چیخوں کو بلند کر دیا اس نے چیختے اور روتے ہوئے بددعا دی۔

''امیر علی تو نے مجھے دھوکا دیا ہے تو نے اپنی اولاد کو ماننے سے انکار کیا ہے خدا کرے تو کبھی باپ نہ بن سکے تو ہمیشہ بچوں کے لئے ترسے اللہ تیرا آنگن ہمیشہ سونا رکھے''

''اٹھا کر کہیں پھینک آؤ حرامزادی کو جہاں اس کی آگ بجھ سکے''

امیر علی نے متکبرانہ لہجے میں کہا اور شکور جلدی سے حکم کی تعمیل میں باہر نکل گیا اور بڑی چوہدرانی نے مسکرا کر پوتے کو یوں دیکھا جیسے اس کی مردانگی کے اعلیٰ کارنامے کو سراہ رہی ہو اور آہستہ سے بولی

''پتر مجھے بتا دیتا تو گڑ اجوائن اسے بھی کھلا دیتی''

جواب میں چھوٹی چوہدرانی منہ پہ پلو رکھ کر ہنس پڑی' جیسے ساس کی بات کا مزہ لے رہی ہو'

دوسرے دن دینو کمہار اور ریشماں کا کہیں پتہ نہ تھا' اس کا چاک ،چکنی مٹی اور برتن اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے' جیسے ان دونوں کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی............!!!! اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد' چوہدری نذیر علی نے اپنے بیٹے کا بیاہ زمیندار علم دین کی بیٹی سے کر دیا۔ دو سال تک جب امیر علی کے آنگن میں پھول نہ کھلا تو اس کی دوسری شادی اس کی چچازاد سے کر دی گئی من کی مراد پھر بھی پوری نہ ہوئی تو امیر علی کو سکینہ بھا گئی جو اس کے شہری دوست فیاض کی بہن تھی'۔ لیکن جب پورا سال گزر گیا اور سکینہ کی کوکھ بھی آباد نہیں ہوئی تو اس نے امیر علی کو مشورہ دیا کہ شہر جا کر وہ اپنا اور اس کا میڈیکل چیک اپ کروائے ، کیونکہ سکینہ بارہ جماعتیں پڑھی تھی اور جانتی تھی کہ خرابی مرد میں بھی ہو سکتی ہے۔ امیر علی کو پہلے تو یہ بات سن کر جھٹکا سا لگا ، یہ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ مرد کوکھ جلا ہو لیکن اس کو سکینہ کی بات مانتے ہی بن پڑی پھر اس نے اپنا بھی ٹیسٹ کروایا لیکن ڈاکٹر نے یہ

کہہ کر بات ختم کر دی۔ ''آپ دونوں مکمل صحت مند ہیں بس اللہ کی مرضی شاید نہیں ہے آپ لوگ دعا کیجئے''...... پھر تو بھلا کون سی درگاہ ہوگی جہاں اس نے حاضری نہ دی ہو...... لیکن اب تو سارا کھیل ہی ختم ہو گیا تھا۔

حویلی میں سوگ کا سماں تھا۔ سکینہ اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ شکور جو امیر علی کا خاص ملازم تھا بڑے چوہدری صاحب کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ شکور چوہدری نذیر کا ملازم نہیں' بلکہ بیٹا ہے، اس کی ماں نوراں اپنی ماں کے ساتھ' حویلی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس کا سلسلہ نسب بھی وہی تھا' جو عام طور پر نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور چوہدری کی حویلیوں اور محلات میں پلنے والی نسل کا ہوتا ہے، کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ گڑ اجوائن اور جائفل تو چوہدری نذیر کی ماں نے بھی نوراں کو کھلائے تھے لیکن اللہ کے آگے کس کی چلتی ہے ......اور پھر شکور پیدا ہوا دائی کو حکم تھا کہ بچے کو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کے مار دیا جائے لیکن چوہدری نذیر نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اسے سونے کے کنگن دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ نوراں اور اس کے بچے کو اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھ لے، حویلیوں کے راز حویلیوں کے اندر ہی دفن ہو جاتے ہیں۔ دائی خیراں کے گھر منتقل ہونے کے تیسرے دن نوراں کو ایک سانپ نے ڈس لیا اور ملازموں کے ذریعے یہ بات باہر آ گئی کہ اس دن چوہدری نذیر نے اپنی چوہدرانی کو بالوں سے پکڑ کر مارا تھا۔

''جا پتر دیکھ کے آ کہ امیر علی کیا کر رہا ہے''۔ چوہدری نذیر نے شکور سے کہا۔ شکور کمرے میں آہستہ سے داخل ہوا تو امیر علی خیالوں میں گم دیوار کو تک رہا تھا' شکور کے قدموں کی آہٹ سنی تو چونک کر دیکھا' اور آہستہ سے بولا۔

''دیکھ شکورے بات باہر نہیں نکلنی چاہیئے ورنہ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا''۔

''آپ پر میری جان قربان چوہدری جی آپ دل چھوٹا نہ کریں میں تو کہتا ہوں آپ امریکہ چلے جائیں' وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں' وہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے''۔

''نہیں شکورے اب کچھ نہیں ہو سکتا مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ریشماں کی بددعا لگ گئی ہو مجھے

یاد ہے اس نے ہمیں کیا بد عادی تھی''؟؟

''ہاں چوہدری جی مجھے یاد ہے میں نے ہی تو اسے دروازے سے باہر نکالا تھا لیکن یہ آپ کا وہم ہے اگر بد دعاؤں سے لوگ مرا کرتے تو آج کوئی بُرا آدمی زندہ نہ ہوتا''

چوہدری نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا...... ''پتہ نہیں کیوں میرا دل کرتا ہے کہ اگر وہ مجھے کہیں مل جائے تو میں اُس سے معافی مانگ لوں میں نے اس کا دل دکھایا تھا یہ سچ ہے کہ میں نے اسے بیوی بنانے کا وعدہ کیا تھا''

''اگر وہ آپ کو مل جائے تو کیا واقعی آپ اس سے معافی مانگیں گے سرکار''؟

شکور نے چوہدری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

''ہاں ہاں بالکل...... میں اس کے پیروں پڑ کے معافی مانگوں گا لیکن وہ نجانے کہاں گئی 'زندہ بھی ہے یا نہیں' پانچ سال سے زیادہ ہو گئے اگر زندہ ہوتی تو کہیں تو دکھائی دیتی'' چوہدری نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

''وہ زندہ ہے سرکار اور آپ کے بیٹے کی ماں بھی ہے آپ کا بیٹا مہتاب پانچ برس کا ہے' شکور نے جیسے بم کا دھماکہ کر دیا

امیر علی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شکور کے دونوں بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا...... ''شکور کیا تو سچ کہہ رہا ہے' اگر یہ سچ ہے تو تو نے مجھے نئی زندگی دی ہے...... بتا وہ کہاں ہے مجھے اس کے پاس لے چل...... میں کسی بھی طرح اس سے معافی مانگ لوں گا وہ ضرور مجھے معاف کر دے گی............ میں ایک بیٹے کا باپ ہوں !!............ یا الٰہی تو اتنا مہربان ہو سکتا ہے؟''

...... چوہدری نے اپنی آنکھوں سے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

''لیکن حضور آپ سب کو یہ کیسے بتائیں گے کہ مہتاب آپ کا بیٹا ہے''؟...... شکور نے پوچھا۔ ''اس کی تو بالکل فکر نہ کر کوئی نہ کوئی تدبیر ابا جی ضرور نکال لیں گے...... بس پہلے تو مجھے اس کو ایک نظر دکھا دے...... لیکن یہ تو بتا کہ تجھے کیسے پتہ کہ وہ کہاں ہے' اور یہ بھی کے وہی میرے بیٹے کی ماں ہے''

''میں نے سوچا تھا کہ یہ راز میرے ساتھ قبر میں جائے گا لیکن آج آپ کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا...... اب یہ نہیں معلوم کہ جب بڑی چوہدرانی کو پتہ چلے گا تو وہ مجھے زندہ چھوڑیں گی یا نہیں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ ریشماں اور اس کے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے''...... شکور نے فکرمندانہ لہجے میں کہا

...... ''کیا مطلب ہے تیرا''؟ ...... چوہدری کی گرج دار آواز میں ہزاروں سوال پوشیدہ تھے ''بتاتا ہوں غور سے سنئے ...... آپ نے جو تیزاب اس پر پھینکا تھا اس سے اس کا ایک ہاتھ اور گلا بری طرح جل گیا تھا کچھ چھینٹے چہرے پر بھی آئے تھے وہ چیختی چلاتی روتی جا رہی تھی گاؤں کے دو تین لوگوں نے اسے حکیم صاحب کے پاس پہنچا دیا اور اسی وقت بڑی چوہدرانی نے مجھے بلایا اور نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ دے کر مجھ سے کہا میں دونوں باپ بیٹیوں کو کسی بہانے یہاں سے لے جاؤں اور ان کا کام تمام کردوں۔ اس کام کے لئے انہوں نے مجھے ایک ہفتہ دیا تھا، میں نے آقاؤں کے حکم پر کئی بندے مارے تھے لیکن نہ جانے کیوں ریشماں اور اس کے بچے کو مارنے کے خیال سے مجھے اپنی ماں نوراں یاد آ گئی، اسے بھی کسی نے مارنے کا حکم دیا تھا...... بس میں نے ایک فیصلہ کرلیا' میں نے دینو کمہار کو ساری بات سچ سچ بتادی' اور پھر اسی رات دونوں باپ بیٹی کو لے کر نکل گیا اور سیدھا شہر کے اس اسپتال میں پہنچا جہاں ماسٹر کرم دین کا چھوٹا بھائی کمپاؤنڈر ہے وہ بڑا نیک بندہ ہے میں نے اسے راز میں شریک کرلیا، وہ ایک بی بی کو جانتا تھا جو وکیل ہے اور دکھی' بے سہارا عورتوں کی مدد کرتی ہے۔ دو دن بعد وہ ریشماں اور دینو کو اپنے ساتھ لے گئی' اس کے گھر پانچ مہینے کے بعد ریشماں نے بچے کو جنم دیا' پھر اس نے ریشماں کا نام بدلا' میٹرک کروایا اور ایک اسکول میں نوکری دلوادی' وہ اب زیتون بانو کہلاتی ہے' مہتاب دو سال کا تھا' جب میں نے اسے دیکھا تھا پھر اس وکیل بی بی نے مجھے ریشماں سے ملنے سے منع کردیا' اس کا خیال تھا کہ اگر میں شہر آتا رہا تو ریشماں اور اس کے بچے کی زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔

گاڑی سے اتر کر شکور نے جب گیٹ کی گھنٹی بجائی تو چند لمحے بعد چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ ''ہم گاؤں سے آئے ہیں' زیتون بی بی سے ملنا چاہتے ہیں آپ اسے بتادیں کہ گاؤں

سے اس کا بھائی شکور آیا ہے'' شکور نے کہا'' صاحب اور بی بی صاحب شہر سے بار گیا ہے اس لئے تم کو اندر آنے کا نہیں بول سکتا تم ادھر ہی ٹھہرو ام زیتون بی بی سے پتہ کر کے آتا ہے'' چوکیدار نے انہیں باہر ہی ٹھہرایا اور گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور شکور کو اندر آنے کو کہا، شکور نے چوہدری کو اشارے سے بلا لیا اور دونوں گیٹ سے اندر داخل ہو گئے، وسیع وعریض بنگلے کے احاطے میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے، ان ہی میں سے ایک کے دروازے پہ ریشماں کھڑی تھی، اس کی صراحی دار گردن پر تیزاب سے جلنے کا نشان تھا، دایاں گال اور کان بھی جھلسا ہوا تھا، اس نے جو امیر علی کو دیکھا تو خوفزدہ ہو کر اندر بھاگی اور دروازہ بند کرنے لگی، شکور نے جلدی سے دروازے کو بند ہونے سے روک لیا اور بولا...... ''ڈرمت ریشماں، میں نے پہلے بھی تیری زندگی بچائی تھی اور آج بھی تجھے ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں''۔

ریشماں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی، امیر علی اندر آ کر نواڑی پلنگ پر بیٹھ گیا جس پر ایک بچہ سو رہا تھا ریشماں نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کے سائے لہرا رہے تھے اس کی نظریں دروازے پر تھیں جیسے کسی کا انتظار ہو۔

''ریشماں یہ مہتاب ہے میرا بیٹا''؟...... امیر علی نے بے قراری سے کہا ''میرا نام زیتون بانو ہے، ریشماں تو اسی روز مر گئی تھی جس دن ایک بھیڑیئے نے اس کا خون کیا تھا اور اس پر تیزاب پھینکا تھا...... چلا جا یہاں سے، مہتاب سے تیرا کوئی ناتا نہیں، یہ صرف میرا بیٹا ہے''...... امیر علی نے بڑھ کر ایک دم ریشماں کے کندھے پکڑ لئے اور گھگھیا کر بولا...... مجھے معاف کر دے ریشماں میں تیرا گنہگار ہوں میرا بچہ مجھے دیدے مجھے ابا کہنے والا کوئی نہیں ہے، مجھے اللہ نے ایسی سزا دی ہے جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی بس اگر میری نسل چلے گی تو تیرے بیٹے سے جو میرا بھی ہے''۔

ریشماں نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے شکور کو دیکھا اور غصے سے بولی ''بھائی شکور تو نے تو کہا تھا یہ راز قبر میں تیرے ساتھ جائے گا''۔ شکور نے اپنی گردن اٹھائی اور آہستہ سے بولا ......''اگر چوہدری جی کا ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو میں کبھی نہ بتاتا ویسے بھی یہ بہت شرمندہ ہیں تو انہیں

معاف کردے اور مہتاب کو انہیں دیدے“۔

”کیسے معاف کردوں؟...... کیا معاف کردینے سے میرا یہ جُھلسا ہوا جسم اور چہرہ ٹھیک ہو جائے گا...... اس نے خدا اور رسول کو گواہ بنا کر مسجد کے پچھواڑے لے جا کر کہا تھا کہ یہ مجھ سے بیاہ کرے گا...... میں اس سے سچا پیار کر بیٹھی تھی ورنہ ریشماں کو تو کوئی چھو بھی نہیں سکتا تھا“۔ ریشماں نے دکھ سے کہا۔

”لیکن قدرت نے انہیں بہت بڑی سزا دی ہے تو بھی انہیں معاف کردے پھر تیرا بیٹا کروڑوں کا وارث بن جائے گا، اس کی زندگی سنور جائے گی“...... شکور نے ایک بار پھر سمجھایا۔

”...... اس سے کہہ گاؤں جا کر تلاش کرے، اس کی منہ زور جوانی نے جن عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہو گا ان میں سے کسی نہ کسی کے پاس اس کی نشانی ہو گی...... بالکل ایسے ہی جیسے بڑے چوہدری صاحب کی منہ زور جوانی کی یادگار تو ہے جس کی ماں نوراں کو بڑی چوہدرانی نے مروا دیا تھا“

ریشماں نے غصے سے کہا۔

شکور کا رنگ فق ہو گیا وہ سہمی ہوئی نظروں سے چوہدری امیر علی کو دیکھ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سارے بدن کا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو

”کیا بک رہی ہے تو؟“ امیر علی دھاڑا

”وہی بک رہی ہوں جو سچ ہے...... پوچھ لے شکور سے بھی، اسے بھی یہ بات معلوم ہے اور اسی لئے اس نے مجھے اور میرے ہونے والے بچے کو بچایا، یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک اور نوراں کی کہانی دھرائی جائے“

ریشماں کے لہجے میں آگ بھری تھی۔

”کیوں شکور...... تو بتا یہ جو کہہ رہی ہے کیا وہ سچ ہے“

امیر علی نے ننھے مہتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکور خوفزدہ چپ چاپ کھڑا رہا“

''بولتا کیوں نہیں جواب دے'' امیر علی نے نرمی سے پوچھا۔

''آپ بڑی چوہدرانی سے پوچھ لیجئے'' شکور کی آنکھوں سے سمندر بہہ نکلا۔

چوہدری امیر علی اپنی جگہ سے اٹھا اور شکور کو گلے لگا کر رو پڑا۔

''اب تم لوگ جاؤ مہتاب کا باپ آنے والا ہوگا' وہ تم لوگوں کو دیکھے گا تو ناراض ہوگا کیونکہ وہ اس سانپ کو اچھی طرح جانتا ہے جس نے مجھے ڈسا تھا اور میری کوکھ اجاڑنا چاہتا تھا''

ریشماں نے نفرت سے امیر علی کی طرف اشارہ کیا''

''مہتاب کا باپ''......امیر علی نے حیرت سے کہا اور اسی وقت ایک دبلا پتلا نوجوان پتلون قمیض پہنے کمرے میں داخل ہوا اور حیرانی سے دونوں مردوں کو دیکھنے گا۔

''قاسم! شکور کو تو تم جانتے ہو!......لیکن آج اس سے بھی مل لو جس کا صرف نام سنا تھا ......یہ ہے چوہدری امیر علی جس نے مجھے برباد کر کے تیزاب سے جلایا تھا''

قاسم نے ایک دم آگے بڑھ کر ریشماں کو سہارا دیا' جو غصے سے کانپ رہی تھی اور مہتاب کو اس کی گود سے اپنی گود میں لے لیا۔

''یہ یہاں کیوں آیا ہے''......قاسم نے بغیر کسی خوف کے کہا۔

''قاسم چوہدری جی اپنا بیٹا لینے آئے ہیں تم ان کا وارث انہیں دیدو......تمہیں اللہ میاں دوسری اولاد دیدیں گے چوہدری صاحب آج اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے آئے ہیں''......شکور نے لجاجت سے کہا

''اچھا! ساڑھے پانچ سال کے بعد آج انہیں اپنا وہ بیٹا یاد آیا ہے جسے انہوں نے کسی اور کا گناہ کہہ کر ریشماں کی توہین کی تھی ....یقیناً ان پر کوئی مصیبت آئی ہے جو یہ ہم غریبوں کی کھوج میں یہاں آئے ہیں''۔قاسم نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''دیکھو تم دونوں یہاں سے دفعان ہو جاؤ''......ریشماں نے کہا

''اگر تم سیدھی طرح نہیں مانو گی تو ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں'' چوہدری نے دھمکی دی۔

ریشماں نے مہتاب کو جلدی سے اپنی گود میں لے لیا اور زہر آلود لہجے میں بولی ''بس

اتار دی اپنی کینچلی؟ آ گئے اصلیت پر؟ چلو ٹھیک ہے تمہاری بات ایک شرط پہ ماننے کو تیار ہوں"
ریشماں نے اچانک کہا

"مجھے تیری ہر بات اور ہر شرط منظور ہے جلدی بتا" چوہدری خوشی سے بولا' قاسم نے کچھ کہنا چاہا تو ریشماں نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔

"وہ شرط یہ ہے کہ تم شکور کو اپنا بھائی تسلیم کر وگے' اور اس کو جائداد اور زمین میں حصہ دے کر کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرو گے اور اسے اپنی چاکری سے ہٹا دو گے...... اگر تم یہ کر سکتے ہو تو مہتاب کو لے جانا لیکن تمہیں گاؤں والوں کو اور اپنے گھر والوں کو بتانا ہوگا کہ مہتاب تمہارا خون ہے"

"دیکھ ریشماں تیری دونوں شرطیں مجھے منظور ہیں لیکن ان میں اتنی تبدیلی کر لے کہ میں صرف اپنی بیویوں اور گھر والوں کو اصل حقیقت بتاؤں گا...... باقی گاؤں والوں سے سچ بولنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں" چوہدری بولا

"ٹھیک ہے تو پھر جا اور پہلی شرط پوری کر، جس دن تو شکور کو اس کی دلہن اور زمین کے کاغذات کے ساتھ لائے گا' اس کے دو دن بعد تو مہتاب کو لے جا سکتا ہے...... لیکن کبھی کبھی اسے مجھ سے ملانے کے لئے لاتے رہنا" ریشماں نے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا

"ٹھیک ہے یہ کام میں ایک ہفتے میں کر دوں گا" چوہدری نے کہا

شکور نے آگے بڑھ کر ریشماں کے پیروں میں سر رکھ دیا اور رونے لگا قاسم نے اسے اٹھایا اور بولا ریشماں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے...... اگر تم اسے یہاں نہ لاتے تو نہ ریشماں زندہ ہوتی نہ مہتاب"

چوہدری اور شکور چپ چاپ وہاں سے چل دیئے، شکور کو تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی آج اسے اپنی ماں نوراں بہت یاد آئی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد قاسم نے ریشماں کو جھنجھوڑ ڈالا

"یہ کیا کر دیا تم نے؟ مہتاب تمہارے اور میرے بغیر کیسے رہے گا میں نے اسے ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا ہے دوسرے لوگ بھی یہی جانتے ہیں کہ وہ میرا بیٹا ہے...... مگر تم نے یہ کیا کر دیا ریشماں؟

پل بھر میں سب کچھ ختم کر دیا"

"چپ رہو اور میری بات توجہ سے سنو!......ریشماں نے آہستہ سے کہنا شروع کیا......
میں گاؤں میں پیدا ہوئی اور گاؤں میں پلی بڑھی ہوں......اس لئے چوہدری کے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہوں......اگر میں مہتاب کو دینے سے منع کر دیتی تو وہ چھین کر لے جاتے' میں نے اپنی تمہاری اور مہتاب کی سلامتی کے لئے یہ سب کیا ہے"

"لیکن جب وہ بچے کو لینے آئیں گے تو کیا کرو گی"؟ قاسم پریشان تھا۔

"وہ میں تمہیں بتاتی ہوں" ریشماں نے کہنا شروع کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

چوہدری کی حویلی میں سب جمع تھے، تینوں بیویاں بھی ایک طرف بیٹھی تھیں لیکن سکینہ کا موڈ آف تھا اچانک بڑی چوہدرانی بولی

"دیکھ پتر' مہتاب کو حویلی میں لا کر یہ بھول جانا کہ ریشماں اس کی ماں ہے وہ میری سکینہ کا بیٹا بن کر راج کرے گا"

"میں بانجھ نہیں ہوں جو کسی کی ناجائز اولاد پالوں......اگر گود ہی لینا ہے تو میں اپنے بھائی ابراہیم کے بیٹے کو گود لوں گی"......سکینہ نے بے رخی سے کہا

"جیسا میں کہوں گا" ویسا ہی تمہیں کرنا ہوگا، یہاں تمہاری مرضی نہیں چلے گی......سمجھیں" !!!امیر علی گرجا

"یہ انداز اپنی دونوں جاہل بیویوں کو دکھاؤ اور اپنی ناجائز اولاد بھی ان ہی کی گود میں دیدو ......میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی مجھے آزاد کردو میں طلاق چاہتی ہوں" سکینہ کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

" بہو یہ کیا کہہ رہی ہو......طلاق شریفوں میں گالی سمجھی جاتی ہے پھر طلاق والی عورت کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا بڑی بدنامی والی بات ہوتی ہے"۔بڑی چوہدرانی نے غصے سے کہا

"طلاق شریفوں میں گالی سمجھی جاتی ہے اور نوکرانیوں' کنیزوں سے ناجائز بچے پیدا کرنا

آپ کے ہاں کیا سمجھا جاتا ہے' یہ مجھے بتا دیجئے''

'' یہ شہر کی پڑھی لکھی ہے' اس کے لئے کیا فرق پڑتا ہے طلاق سے' دیدے امیر علی اسے اسی وقت طلاق بڑے چوہدری صاحب بولے۔

''نہیں سکینہ ایسا نہ کرو بیویاں تو دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہیں' اور تم ایسی صورت میں میرے بیٹے کو چھوڑنے کی باتیں کر رہی ہو''۔ امیر علی کی ماں نے کہا

'' کہاں کی مصیبت اور کہاں کا دکھ...... سب کچھ مردوں کے لئے ہے، آپ کے بیٹے کے اولاد نہیں ہوئی تو اس نے تین تین شادیاں کرلیں کیونکہ وہ باپ بننا چاہتا تھا، لیکن ماں جی عورت بھی انسان ہے اس کے بھی دکھ سکھ ہیں کبھی امیر علی نے سوچا کہ جب صغریٰ ماں نہ بنی تو وہ اس پر کنیز کو سوکن بنا کر لے آیا اور ایک لمحے کو بھی نہ اس نے سوچا نہ آپ لوگوں نے کہ اس میں ان دونوں کا کوئی قصور نہیں اور پھر جب بے چاری کنیز بھی نامراد رہی تو مجھے بیاہ لایا...... ماں تو ہر عورت بننا چاہتی ہے میں بھی ماں بننا چاہتی ہوں کیونکہ میں بانجھ نہیں ہوں، بانجھ ہو گیا ہے آپ کا بیٹا اور میں ایک ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی جو بے ثمر ہو''...... سکینہ بغیر کسی لحاظ کے بولتی چلی گئی۔

''وہ تو مرد ہے اسے اسلام نے اور شرع نے چار شادیوں کا حق دیا ہے'' امیر علی کے باپ نے کہا

''اسلام نے عورت کو بھی برابر کے حقوق دیئے ہیں جنہیں عورتوں سے چھپا کر رکھا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے حق کا مطالبہ نہ کرنے لگیں'' سکینہ بے خوفی سے بولی۔

''تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے''...... امیر علی نے طویل خاموشی کے بعد کہا

''بالکل آخری...... جب تم اولاد کی خواہش میں تین تین شادیاں کر سکتے ہو اور اپنے ناجائز بچے کو گھر لا سکتے ہو تو میں بھی اپنی مرضی سے تم سے خلع حاصل کر سکتی ہوں۔ میں نے بھائی ابراہیم کو فون کر دیا ہے وہ آج ہی مجھے لینے آ رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆
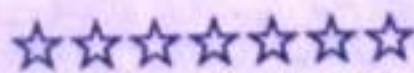
شکور کی شادی امیر علی نے گاؤں کے کمپاؤنڈر کی بہن سے کر دی اور ساتھ ہی کچھ زمین اور گائے بھینسیں بھی دیدیں۔ امیر علی کے باپ نے شکور کو ایک پکا مکان بھی بخش دیا، تمام کاموں

سے فراغت پا کر جب امیر علی شکور کے ساتھ مہتاب کو لینے پہنچے تو مکان پہ بڑا سا تالا پڑا تھا، شکور نے گاڑی سے اتر کر دو چار لوگوں سے پوچھا تو پتہ چلا قاسم اور زیتون چند دن پہلے دوبئ چلے گئے ہیں، جہاں قاسم کو اچھی نوکری مل گئی ہے، امیر علی یہ سن کر غش کھا کر گر پڑا اس کے لئے وہی گوشہ قفس تھا وہی فصل گل کا ماتم۔

☆☆☆☆☆☆☆

''ہم تینوں کو اپنے اپنے نام اور حلیئے بدل لینے چاہییں'' قاسم نے ریشماں سے کہا

''اور کچھ عرصے تک مجھے اور مہتاب کو گھر سے بالکل نہیں نکلنا ہے''

''بیگم صاحب کتنی اچھی ہیں انہوں نے ہمارا کتنا خیال رکھا ہے اور ان کا یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ ہمیں مہتاب کو کسی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دینا چاہیئے''

ریشماں نے کہا اور مہتاب کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

✠✠✠✠✠✠✠

''رینا عبدالکریم''

''سنا تم نے!...... مسز ہمدانی کو آخر اپنے بیٹے کے لئے لڑکی پسند آ ہی گئی'' عبیدہ نے ہنس کر کہا۔
''اچھا! کون ہے وہ خوش نصیب! انہیں تو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی، کسی کی ناک چپٹی ہے، کسی کی آنکھیں چھوٹی ہیں، کوئی موٹی ہے تو کسی کا رنگ دبتا ہوا ہے'' میں نے تعجب سے پوچھا
''ارے بھئی کوئی بہت مالدار گھرانہ ہے، شہر کے فیشن ایبل علاقوں میں لڑکی کی ماں کی بوتیک ہے...... اور لڑکی کا رنگ بھی گورا ہے''

عبیدہ بولی

''جہاں تک میرا خیال ہے انہیں شکل وصورت کے ساتھ ساتھ دولت بھی چاہیے تھی، کئی لڑکیاں تو میں نے بھی انہیں دکھائی تھیں، لیکن سب شریف اور متوسط خاندان کی تھیں اس لئے انہوں نے ناپسند کر دیا'' بہر حال اب تو تجسّس رہے گا کہ کون ہے وہ خوش نصیب جس کا قرعہ فال ان کے بیٹے کے نام نکلا ہے''

''دراصل بیٹا خوبصورتی چاہتا ہے اور ماں اونچا گھرانہ'' عبیدہ نے بتایا

اور پھر دو دن بعد ہی مسز ہمدانی اپنے بیٹے کی شادی کا کارڈ لئے آ موجود ہوئیں، بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور فخریہ کہہ رہی تھیں کہ ان کی ہونے والی بہو ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی ہے ایک ہزار گز کا بنگلہ ہے اور ماں کے صدر اور کلفٹن میں دو بوتیک ہیں جہاں کسی بھی جوڑے کی کم از کم قیمت دو ہزار ہے، انہوں نے مہندی اور مایوں کا بھی بلاوا دیا تھا اور مجھے بمعہ فیملی نہایت اصرار سے آنے کو کہا تھا، ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی، کارڈ بھی بہت قیمتی تھا' نکاح اور ولیمہ دونوں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھے البتہ مہندی اور مایوں کی تقریب گھر میں رکھی تھی۔

مسز ہمدانی میرے اور عبیدہ کے ساتھ ایک ہی کالج میں پڑھاتی تھیں، اور ہم تینوں کی دوستی بہت گہری تھی بلکہ ہم تینوں کے گھرانوں کا ایک دوسرے سے بھی ملنا جلنا تھا، مہندی کی تقریب خالصتاً خواتین کی تھی اس لئے مجھے عبیدہ کے ساتھ جانا پڑا میرے میاں ویسے بھی تقریبات میں شرکت سے گھبراتے ہیں، یہی بہت تھا کہ انہوں نے نکاح اور ولیمے میں جانے کی حامی بھر لی تھی، لہٰذا میں عبیدہ اور اس کی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ جب مسز ہمدانی کے گھر نارتھ ناظم آباد پہنچے تو مہمان زیادہ نہیں آئے تھے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسز ہمدانی ہمیں بری کے جوڑے اور زیورات دکھانے لگیں جو کہ بہت قیمتی تھے، یونہی باتوں باتوں میں میں نے اُن سے پوچھ لیا کہ یہ رشتہ کس نے طے کروایا؟ اس پر وہ آہستہ سے بولیں ''ایک شادی دفتر کے ذریعے یہ رشتہ ہوا ہے'' اور ساتھ ہی انہوں نے تاکید کی کہ یہ بات میں دوسروں کو نہ بتاؤں، بہر حال مہمانوں کے جمع ہونے کے بعد قافلہ کئی گاڑیوں میں پی ای سی ایچ سوسائٹی کی طرف روانہ ہوا، اور تھوڑی دیر بعد ہی دلہن کا گھر جگمگاتا ہوا نظر آنے لگا، راستے میں مسز ہمدانی مجھے اور عبیدہ کو بتانے لگیں کہ دلہن کا خاندان بنگلہ دیش بننے کے بعد مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے کراچی آیا تھا، وہاں ان کی کاغذ اور کپڑے کی ملیں تھیں جنہیں بلوائیوں نے لوٹ لیا۔ شوہر اور بچوں کے ساتھ یہ بمشکل جان بچا کر آئیں لیکن عقل مندی یہ کی کہ جیسے ہی حالات خراب ہونے شروع ہوئے انہوں نے سرمایہ کراچی منتقل کر دیا اور پھر بعد میں یہاں بوتیک کھول لئے، جس سے ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو رہی ہے، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا کہ فریج، ٹی وی، کار، وی سی آر اور بیش قیمت فرنیچر کے علاوہ گلستان جوہر میں چار سو گز کا بنگلہ بھی بیٹی کو جہیز میں دیا ہے۔

دلہن والے پھولوں کے ہار سمدھنوں کے واسطے لئے کھڑے تھے۔ مہمان اندر جا کر بیٹھے تو تھوڑی دیر بعد دلہن کو لایا گیا تا کہ اسے پھولوں کا گہنا پہنا کر رسم پوری کی جائے، لڑکی جب اسٹیج پر آ کر بیٹھی تو عبیدہ مجھ سے بولی...... ''اونہہ! صرف رنگ ہی رنگ ہے پھیکا شلجم نقشہ کتنا موٹا موٹا ہے''

عبیدہ کی بات درست تھی، دلہن کے مقابلے میں عبیدہ کی بیٹی نویدہ کہیں زیادہ پیاری تھی لیکن مسز ہمدانی کو اس کے سانولے رنگ پر اعتراض تھا یا شاید عبیدہ سے اتنا بھاری جہیز ملنے کی امید نہ تھی، اچانک مسز ہمدانی ایک خاتون سے اٹھ کر گلے ملنے لگیں اور پھر ان خاتون کا تعارف مجھ سے اور عبیدہ سے کرواتے ہوئے بولیں۔

''عبیدہ اور نوشابہ ان سے ملو یہ دلہن کی ماں ہیں مسز رینا عبدالکریم'' جیسے ہی میری نظریں دلہن کی ماں سے ملیں، میں اپنی جگہ جیسے منجمد ہوگئی...... یا خدا! مسز رینا عبدالکریم یا..........؟ میں گڑبڑا گئی...... دلہن کی ماں کے چہرے پر بھی جیسے سایہ سا لہرایا ہو شاید وہ بھی مجھے پہچان گئی تھی...... یا شاید میرا وہم ہی ہو...... میں نے سوچا کبھی کبھی دو شکلیں اس حد تک آپس میں ملتی ہیں کہ مغالطہ ہو جاتا ہے...... لیکن یہ مغالطہ نہیں تھا...... وہ معصومہ ہی تھی!...... اس کی ناک پہ بڑا سا تل صاف کہہ رہا تھا کہ وہ معصومہ ہی ہے۔

کئی قسم کے بہترین کھانوں سے مہمانوں کی تواضع کی گئی تھی۔ میں دلہن کی ماں کو تلاش کر رہی تھی لیکن پھر وہ مجھے دوبارہ نظر نہ آئیں، رات کے ایک بجے جب ہم واپس گھروں کو آرہے تھے تو میں خود کو جھٹلا رہی تھی کہ وہ معصومہ نہیں ہوسکتی، کہاں معصومہ اور کہاں کروڑ پتی رینا عبدالکریم!

گھر پہنچ کر جب میں نے سجاد سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بولے کہ چونکہ میں کہانی کار ہوں اس لئے ہر بات کو افسانہ بنا دیتی ہوں، بہرحال اگلے دن جب کالج گئی تو میرا بے اختیار جی چاہا کہ اپنی الجھن کا ذکر عبیدہ سے کروں...... لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ خواہ مخواہ کی شرمندگی نہ ہو، دوپہر میں گھر آکر آرام کرنے لیٹی ہی تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو سامنے رینا عبدالکریم کھڑی تھی یعنی دلہن کی ماں اور مسز ہمدانی کی سمدھن!!

''آپ'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا

''جی میں...... مجھے آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے'' وہ دھیمے لہجے میں بولیں

''آیئے...... اس وقت میرے علاوہ گھر میں کوئی اور نہیں ہے''

میں نے اسے ڈرائنگ روم میں میں لاتے ہوئے کہا

''میں آج اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ میری عزت آپ کے ہاتھ ہے...... کل میری بیٹی کی شادی ہے اور آج ہم لوگ دولہا والوں کے گھر دولہا کا جوڑا لے کر جائیں گے جہاں یقیناً آپ بھی ہوں گی'' وہ بے چینی سے بولی

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں ٹھیک پہچانا ہے، تم معصومہ ہو''؟ میں نے جلدی سے کہا

''جی!...... میں معصومہ ہی ہوں، جو آپ کی امی کے گھر برتن جھاڑو کرتی تھی، استری کرتی

تھی اور خانساماں کو سبزی کاٹ کر دیتی تھی'' اس کی آواز میں خوف تھا!

''میں تو تمہیں کل ہی پہچان گئی تھی لیکن پھر بھی سو فیصد یقین نہ تھا لیکن میں نے کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ میرے کنوارپنے کی ''ماسی'' آج ایک لکھ پتی عورت ہے ویسے بھی میری بات کا یقین کون کرتا'' البتہ میں حیران ضرور تھی کہ تمہاری یہ کایا پلٹ ہوئی کیسے؟ یہاں شادی کو دس سال ہوگئے ہیں ہم دونوں ملازمت کرتے ہیں لیکن ابھی تک اپنا ذاتی فلیٹ تک نہیں کر سکے۔ تمہارے ہاتھ کون سا الہ دین کا چراغ لگ گیا جو معصومہ ماسی سے رینا عبدالکریم بن بیٹھیں'' میں نے بیزاری سے کہا

''میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی'' وہ بولی، لیکن خدا کے واسطے نوشابہ بی بی آپ کو اپنے سہاگ اور دونوں بچوں کا واسطہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کیجئے گا...... میں جانتی ہوں آپ بہت ہمدرد ہیں۔ تین سال میں نے آپ کے گھر کام کیا ہے اسی لئے اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے اور میری بیٹی کو بے عزت نہیں کریں گی اور اس راز کو راز ہی رہنے دیں گی'' وہ گڑگڑائی

ٹھیک ہے...... تم بے فکر رہو...... لیکن مجھے بتاؤ ضرور کہ اچانک ریگستان میں پھول کیسے کھل اٹھے؟

اس نے ٹیبل پہ رکھا پانی پیا اور پھر بولی'' نوشابہ بی بی یہ تو آپ جانتی ہی ہیں میں نویں جماعت میں تھی کہ ایک شخص جو میرا ہم مذہب اور میرا ہم زبان تھا میری ماں کو دس ہزار ٹکا دے کر مجھ سے نکاح کر کے کراچی لے آیا یہاں آکر معلوم ہوا کہ یہاں مجھ جیسی اور بھی عورتیں ہیں جنہیں کریم نکاح کر کے لایا تھا' دراصل وہ ایک پیشہ ور دلال تھا جس کا ایک بڑے گینگ سے تعلق تھا، یہ لوگ ملک سے باہر اور ملک کے اندر'' مال سپلائی'' کرتے تھے اس کے علاوہ شہر کے مختلف علاقوں میں فحاشی کے اڈے بھی پولیس کی سرپرستی میں چلتے تھے، کریم نے مجھے بھی اس کام پر لگا دیا، میں روز مرتی تھی لیکن دم نہیں نکلتا تھا، پھر ایک دن میں موقع پا کر فرار ہوگئی اور خوش قسمتی سے آپ کے گھر تک پہنچ گئی آپ کی والدہ اور والد نیک لوگ تھے انہوں نے مجھے تحفظ بھی دیا اور ٹھکانہ بھی، تین سال تک میں بہت خوش اور مطمئن رہی، پھر ایک دن آپ کے ڈرائیور نے مجھے دوبارہ کریم کے اڈے پہ پہنچا دیا، کیونکہ دو تین دفعہ میں اس کی شکایت بیگم صاحبہ سے کر چکی تھی۔ جب وہ اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو اس طرح بدلہ لیا کہ کریم سے پیسے لے کر

دوبارہ جہنم میں پہنچادیا“

”اچھا تو یہ بات تھی، مگر رحیم داد تو خود تمہاری گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے میں پیش پیش تھا“...... میں نے اس کا سلسلہ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا۔

”بس نوشابہ بی بی...... پہلے تو اس نے مجھے مارا پیٹا اور دوبارہ دھندے پہ لگانا چاہا...... میں چونکہ بھرے بھرے بدن کی خوش شکل عورت تھی اس لئے میرے ”ریٹ“ اور گاہک دونوں زیادہ تھے، لیکن میں پھر بھی نہ مانی تو اُس نے مجھے پیار سے سمجھانا شروع کیا...... اس نے مجھے بتایا کہ یہ ”عزت آبرو“ صرف مڈل کلاس کی باتیں ہیں‘ اونچے طبقے میں تو عصمت اور پاکیزگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ لوگ اپنی ترقی کے لئے خود اپنی بیویوں کو دوسروں کے پاس بھیجتے ہیں، جس کی بیوی جتنی حسین ہوگی، اتنی ہی جلدی اس کی ترقی بھی ہوگی۔ بیوی حسین نہ ہو تو کام نکلوانے کے لئے لوگ ہماری خدمات حاصل کرتے تھے...... اسی دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ بظاہر ٹی وی اداکارہ نظر آنے والی دو خواتین دراصل ”سپلائیر“ ہیں‘ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹے سے فلیٹ سے ڈیفنس کے عالیشان فلیٹ میں منتقل ہوگئیں، بظاہر ایک کا بیوٹی پارلر ہے اور دوسری کا بوتیک ہے لیکن دراصل وہ ہماری ہی برادری کا حصہ ہیں“

وہ چائے پینے کے لئے رکی تو میں نے کہا‘

”تمہیں اپنا گھر، ماں باپ سب یاد تو آتے ہوں گے دل بھی چاہتا ہوگا واپس اپنے وطن جانے کو“۔

”پہلے تو واقعی جی چاہتا تھا پر اب نہیں وہاں غربت کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے“۔

”لیکن کبھی تو تمہیں ایک خلش کا احساس ہوتا ہوگا تم بھی عزت سے جیتیں اور معاشرے میں سر اٹھا کر چلتیں“۔...... میں نے کہا

”عزت!! وہ پھیکی ہنسی ہنسی ”بی بی عزت صرف اور صرف پیسے سے ملتی ہے، آج میں آئے دن کسی نہ کسی تقریب میں ربن کاٹتی ہوں کیونکہ میں انہیں ٹھیک ٹھاک ڈونیشن بھی دیتی ہوں اور اخبارات میں تصویریں بھی چھپواتی ہوں...... آپ نے کبھی کسی غریب محنت کش کو کسی تقریب کا افتتاح کرتے دیکھا ہے...... سب پیسے کو سلام کرتے ہیں...... کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ پیسہ کہاں سے آیا اور کس طرح آیا...... ”اوپر کی آمدنی“ کا ذکر آج فخریہ کیا جاتا ہے...... میں زیادہ پڑھی

لکھی نہیں ہوں لیکن یہ جانتی ہوں کہ حکومت میں جو آج بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے عہدوں سے چپکے ہوئے ہیں ان میں سے کتنوں کی بیٹیاں پاؤں میں گھنگھرو باندھے بازار میں بیٹھی ہیں اور کس کی بیوی کس کے ساتھ کب اور کہاں ہوتی ہے''۔

''لیکن کبھی تو تم عزت سے جینا چاہتی تھیں اس لئے تین سال ہمارے گھر گذار دیئے''

بالکل صحیح کہا آپ نے ......اس وقت میرے نزدیک عزت ہی سب کچھ تھی لیکن کیا اس عزت کے ساتھ مجھے کوئی شریف گھرانہ اپنی بہو بنا سکتا تھا...... ہرگز نہیں!...... کیونکہ میں ایک ماسی تھی ......لیکن آج دولت کی بدولت مسز ہمدانی نے میری بیٹی کو اپنی بہو بنالیا...... اخبارات میں تصاویر کے ساتھ مسٹر اور مسز ہمدانی کا نہیں رینا عبدالکریم کا نام اور تصویر چھپے گی' شادی میں معزز عمائدین شہر شرکت کریں گے اور کئی دنوں تک اس تقریب کو یاد رکھیں گے! کیا میں برتن جھاڑو کرکے اپنی بیٹی کو اس طرح بیاہ سکتی تھی؟ ......البتہ میں نے اب یہ کام چھوڑ دیا ہے اور دوسری عورتوں کی طرح اب صرف ''مال سپلائی'' کرتی ہوں''۔

نکاح والے دن شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل میں شہر کی معزز ترین اور امیر کبیر ہستیاں رینا عبدالکریم کی بیٹی کی شادی میں شریک تھیں، خوبصورت لڑکیاں اور ماڈل گرلز بطور خاص اس تقریب میں شریک تھیں کیونکہ ''مال خریدنے'' اور ''مال بیچنے'' کے لئے اس قسم کی محفلیں محفوظ خیال کی جاتی ہیں، رینا عبدالکریم کبھی اخبارات کے ایڈیٹرز سے ہنسی مذاق کرتی کبھی کوئی صنعت کار اس کی توجہ کا مرکز بن جاتا پھر وہ اپنے خاص مہمانوں کو ''خاص میزبانوں'' کے سپرد کرکے گیٹ کی جانب بڑھی جہاں سے پولیس کا ایک اعلیٰ عہدیدار اندر آ رہا تھا۔

''دیر ضرور ہوگئی لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کی بیٹی کی شادی میں ہم نہ آتے'' اعلیٰ عہدیدار نے مسکرا کر کہا......

رینا عبدالکریم نے مسکرا کر ساڑھی کا پلو ڈھلکایا اور پولیس آفیسر کے بازو میں بازو ڈال کر اگلی صفوں میں لے آئی فوٹو گرافر نے دونوں کا پوز اگلے دن کے اخبار کے لئے بنایا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

✠✠✠✠✠✠✠

”کیکٹس“

اور عتیقہ مرگئی!...... اپنے تمام تر دکھوں کو اپنے ساتھ لئے وہ قبر میں جا سوئی!...... لیکن اپنے پیچھے دو جوان بیٹیوں کو بے آسرا چھوڑ گئی ...... جو اپنے رویوں اور مزاج میں، دوسری عتیقہ تھیں!

...... میں دہل کر رہ گئی، تدفین کے تمام تر انتظامات عتیقہ کے سسرال والوں نے کئے، پہلے دن سے لے کر چالیسویں تک میں روز جاتی رہی کیونکہ ایک میں ہی تھی جو اس کو سمجھتی تھی، سمجھاتی تھی اور بعض اوقات ڈانٹ بھی دیتی تھی، اس نے زندگی بھر اپنی شادی شدہ، زندگی سے سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی سسرال والوں کو کبھی توجہ کے قابل سمجھا، ہٹ دھرمی اور ضد اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی، وہ ایک ٹوٹے ہوئے گھر کی بیٹی تھی جہاں ماں باپ طبیعتوں کے اختلاف کے باعث الگ الگ رہتے تھے، عتیقہ اور بھائی جمال احمد باپ کے ہمراہ تھے اور چھوٹی بہن رفیعہ ماں کے ساتھ تھی، جس طرح خودسری اور جھوٹی انانیت نے عتیقہ کی ماں کو بیوی بننے سے روکے رکھا، وہیں ضدی اور کنجوس باپ نے بھی کوئی سمجھوتہ نہ کیا، عتیقہ کی ماں دہلی کے ایک معزز گھرانے کی فرد تھیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں جبکہ باپ کا تعلق ایک غریب مگر شریف گھرانے سے تھا، عتیقہ کی والدہ نے شوہر کو دل سے قبول نہ کیا جس کا نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکلا اور پھر یہی کہانی عتیقہ کے ساتھ بھی دوہرائی گئی...... اور عتیقہ کی موت کے بعد مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہی کہانی اس کی بیٹیوں کیساتھ بھی نہ دہرائی جائے۔

میں نے پہلی بار عتیقہ کو اپنے کالج میں دیکھا تھا۔ وہ تھرڈ ایئر میں تھی اور میں فرسٹ ایئر میں کالج کی بس سے اتر کر جب میں جھیل پارک کے پاس اپنے گھر پہنچتی تو اکثر اسے بھی ایک گھر میں داخل ہوتے دیکھتی، وہ بہت گوری اور خوش شکل تھی، سیاہ برقعے میں ملبوس وہ ہمیشہ اپنا چہرہ

نقاب میں چھپائے رکھتی، ایک دن جب وہ ہمارے سامنے والے بنگلے میں داخل ہونے لگی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ بھی کالج، بس سے کیوں نہیں آتی جاتی ...... اس پر اس نے افسردہ چہرے سے جواب دیا۔

''میں یہاں رہتی نہیں ہوں بلکہ ٹیوشن پڑھانے آتی ہوں''

''اور آپ رہتی کہاں ہیں''؟ میں نے ادب سے پوچھا کیونکہ وہ سینئر تھی

''مارٹن کوارٹرز'' ...... اس نے مختصر سا جواب دیا...... یہ اس سے میری پہلی ملاقات تھی۔ کالج میں بھی وہ کبھی کسی تقریب میں نظر نہ آتی جبکہ میں تمام تقریبات میں دل و جان سے شریک ہوتی تھی خواہ مباحثہ ہو افسانہ نگاری کا مقابلہ ہو یا مینا بازار...... سب کچھ میرے لئے بہت ضروری تھا۔ میرا وقت گھر میں کم اور کالج میں زیادہ گزرتا تھا، لیکن مجھے کبھی 'عتیقہ' کسی بھی پروگرام میں نظر نہ آئی، پھر ایک دن جب میں کالج میگزین کی ایڈیٹر کی حیثیت سے افسانوں اور غزلوں کا انتخاب کر رہی تھی، تو عتیقہ نے اپنی دو غزلیں لفافے میں رکھ کر دیدیں کہ میں انہیں میگزین میں لگا دوں۔ یہ میری اس سے دوسری ملاقات تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

میرے ہاں جب پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی تو یہ مسئلہ آن کھڑا ہوا کہ سروس کے دوران بچے کو کہاں چھوڑوں، سسرال والے سب بیرون ملک رہائش پذیر تھے اور میری اپنی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، سوتیلی ماں کو میرا وجود تک گوارہ نہ تھا کیونکہ میں اپنے والدین کی چہیتی اولاد تھی، اس لئے یہ مسئلہ منہ پھاڑے سامنے کھڑا تھا، ایسے میں میری ایک کالج فیلو نے ایک ایسے نرسری اسکول کا پتہ بتایا جہاں تیسری جماعت تک تعلیم بھی دی جاتی ہے اور جاب پر جانے والی ماؤں کے بچوں کو بھی رکھا جاتا ہے۔ میری دوست جب مجھے لے کر وہاں پہنچی تو ایک لمبی چوڑی بھاری بھرکم گوری رنگ کی عورت نے ہمارا استقبال کیا...... وہ مسکرا کر بولی،

''میں آپ کو جانتی ہوں آپ کراچی کالج میں یونین کی صدر اور میگزین ایڈیٹر تھیں نا''

میں نے حیران ہو کر اسے پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی تو اس نے میری مشکل

آسان کرتے ہوئے کہا۔

''میں عتیقہ ہوں، کالج میں آپ سے دو سال سینئر تھی اور سوسائٹی میں آپ کے گھر کے قریبی بنگلے میں ٹیوشن بھی پڑھانے آتی تھی'' ...... پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی...... ''مجھے اب کوئی بھی نہیں پہچانتا...... میں بہت بدل گئی ہوں نا''

یہ عتیقہ سے میری تیسری ملاقات تھی اور اس ملاقات کے بعد ہم گہری سہیلیاں بن گئے۔ اس کی ایک بیٹی تھی مدیحہ، شوہر حیدر آباد میں رہتے تھے' اپنے بھائیوں' بھاوجوں اور ان کے بچوں کے ساتھ' اور عتیقہ یہاں ایک بچی اور اپنے والد کے ساتھ کراچی میں تھی اور اپنا چھوٹا موٹا اسکول چلاتی تھی۔ میاں ہفتے کو آتے تھے اور پیر کی صبح واپس چلے جاتے تھے، رفتہ رفتہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک پنا میرے سامنے کھولتی گئی تب مجھے پتہ چلا کہ وہ کتنی بدنصیب ہے شاید اس کی قسمت کے ستارے اس کی پیدائش سے لے کر آج تک گردش میں تھے۔ ایک دن جب میں اپنی امی کی فاتحہ دلوا رہی تھی تو وہ بھیگی آنکھوں سے بولی ''تم کتنی خوش قسمت ہو کہ مرنے کے بعد بھی تمہاری والدہ تمہارے ساتھ ہیں''

''اور تمہاری والدہ...... میں نے سوال کیا۔

''وہ تو زندگی میں بھی کبھی میرے ساتھ نہ تھیں، جب میں اور رفیعہ اسکول سے گھر آتے تھے تو اماں اور ابا میں اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ دروازہ کون کھولے گا۔ اماں کو اپنے خاندانی پس منظر اور تعلیم پر غرور تھا اور ابا کو شوہر ہونے کا دعویٰ...... نتیجہ یہ کہ ہم دونوں بہنیں دروازہ پیٹتی رہتیں اور محلے والے ترس کھا کر ہمیں اپنے گھر بلا لیتے' بعض اوقات اس بحثا بحثی میں رات کو بھی دروازہ نہ کھلتا اور ہم دونوں بہنیں باہر ہی رات گذار دیتیں، میں رفیعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے سو جاتی، یہ ساٹھ کی دہائی کی بات ہے جب کراچی والوں کیلئے راوی چین ہی چین لکھتا تھا'' اس نے روتے ہوئے کہا

ایک دن جب میں کالج سے واپسی پر اپنے بیٹے افراسیاب کو لئے اس کے گھر پہنچی تو اس کے گرانٹ والد کے بجائے' ایک گہرے سانولے رنگ کے شخص نے گیٹ کھولا اور سلام کر کے ایک طرف ہو گیا یہ نعمان بیگ تھے' عتیقہ کے شوہر' جن کی پکی رنگت میں ایک خاص کشش اور

جاذبیت تھی، دیکھنے میں نہایت شائستہ اور نہایت کم گو اس کے بعد اور بھی کئی بار نعمان بیگ سے ملاقات ہوئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ عتیقہ اور اس کی دس سالہ بیٹی مدیحہ کا رویہ نعمان بیگ سے زیادہ اچھا نہ تھا۔ عتیقہ بعض اوقات انہیں سب کے سامنے جھڑک دیتی۔ ایک دن جب میں نے اسے اس بات پر ٹوکا تو وہ تلخی سے بولی

''تم ایسا اس لئے کہہ رہی ہو کہ تمہاری شادی تمہاری پسند سے اور تمہارے ہم پلہ خاندان میں ہوئی ہے، اگر تم میری جگہ ہوتیں تو پتہ چلتا کہ اپنے سے کم تر آدمی کے ساتھ گذارہ کرنا کتنا مشکل ہے، نہ تعلیم نہ خاندانی پس منظر نہ اسٹیٹس کچھ بھی نہیں''

''کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں میں نے کہا ...... ''شادی کی پہلی رات کتنی امنگوں اور آرزوؤں بھری ہوتی ہے۔ عورت کسی کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ شخص گھونگھٹ اٹھا کر کہے ...... تم ''کتنی کھپ صورت'' لگ رہی ہو، کسم کھدا کی چاند ہو چاند' ...... تو اس عورت پر کیا گذرے گی، جس کے خاندان کا تعلیمی پس منظر بہت اعلیٰ ہو اور جس کے ہاں شین قاف درست نہ ہونے پر کڑی سزا ملتی ہو ...... یہ کارپینٹر میرے ہی نصیب میں لکھا تھا! جس کا تعارف اپنی دوستوں سے کراتے بھی مجھے شرم آتی ہے''

''ایسا تھا تو تم نے یہ شادی کیوں کی؟ تم اتنی پیاری اور حسین ہو کہ تمہارے لئے تو رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی'' ...... میں نے جاننا چاہا۔

''یہ بھی ایک الگ کہانی ہے صنوبر، خدا مجھ جیسی قسمت کسی کو نہ دے، وہ بہن جس کو میں نے گودوں میں کھلایا تھا اس کی شادی مجھ سے پہلے ہوئی تھی کیونکہ وہ امی کے پاس رہتی تھی اور ان کی چہیتی تھی چنانچہ ننھیال والوں کی بدولت اس کی شادی ایک نہایت پڑھے لکھے اور اعلیٰ خاندان میں ہوگئی جو آج کل کینیڈا میں ہے اور جس کا مجھ سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس کے شوہر کو یہ ڈر تھا کہ کہیں دوسرا داماد اس سے زیادہ قابل نہ آجائے، سو ایک دن جب ابا نے حسب عادت مجھے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تو میری بہن اور بہنوئی مجھے اپنے گھر لے گئے اور ایک ہفتے میں میری شادی نعمان بیگ سے کروادی ...... میں اپنے ابا سے نجات چاہتی تھی اس لئے بہن بہنوئی کو ہمدرد جانا اور اس طرح ایک جہنم سے نکل کر دوسرے اندھے کنویں میں قید ہوگئی''

''کیا ان کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے''۔ میں نے پوچھا۔ اس دوران اس کی بیٹی مدیحہ قریب بیٹھی باتیں سنتی رہی۔

''نہیں سلوک تو ان کا کبھی مجھ سے خراب نہیں رہا، ہمیشہ بہت خیال رکھتے ہیں''

''تو پھر تمہارے سسرال والوں کا رویہ خراب ہوگا، اسی لئے تم حیدر آباد میں ان کے ساتھ نہیں رہتیں''

''ارے نہیں ایسا بھی کچھ نہیں ہے نعمان نے خود مجھے کراچی میں رکھا ہے کہتے ہیں کہ ان کے گھر کی خواتین ان پڑھ ہیں میرا گذارا ان کے ساتھ ہونا ناممکن ہے اس لئے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے مجھے گھر لے کر دیا ہے اور اسکول بھی کھلوایا تاکہ میں اکیلی بور نہ ہو جاؤں''۔

''لیکن وہ تمہارے ساتھ رہتے کیوں نہیں'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

عتیقہ کے بجائے اس کی دس سالہ بیٹی جھٹ سے بولی

''آنٹی ہمارے ابو کو ہم سے پیار نہیں ہے انہیں اپنے بھائی اور ان کے بچوں سے زیادہ پیار ہے اس لئے ہمارے ساتھ نہیں رہتے ......اور مجھے اپنے ابو بالکل اچھے نہیں لگتے''۔

''عتیقہ بچی کا معصوم ذہن زہر آلود مت کرو یہ چیز خود مدیحہ کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے'' میں نے سمجھانا چاہا۔

''میں ایسا ارادتاً کرتی ہوں کیونکہ نعمان کو اپنے خاندان سے بہت پیار ہے اور وہ میری بیٹی کو اپنے ہی خاندان میں بیاہنا چاہتے ہیں......اور میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی'' وہ غصے سے بولی

''تو کیا نئی نسل بھی بالکل جاہل ہے'' میں نے جاننا چاہا

نہیں وہ تو سب پڑھ رہے ہیں لیکن اپنا آبائی پیشہ نہیں چھوڑا ہے اور نہ چھوڑنا چاہتے ہیں ......کہنے کو فرنیچر کا کاروبار ہے لیکن کہلائیں گے تو وہی بڑھئی''

اتنا کہہ کر اس نے مدیحہ کو کسی کام سے باہر بھیجا اور آہستہ سے مجھ سے کہنے لگی۔

''نعمان تو یہاں رہنا چاہتے ہیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں مستقل رہے۔ بس ہفتے میں دو دن بہت ہیں۔ اس سے زیادہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ ورنہ وہ بچوں کی فوج گھر میں لگا دے گا اور مجھے اس کا وجود گوارا نہیں ہے''۔

☆☆☆☆☆☆☆

عتیقہ کے ہاں تیسرے بچے کی ولادت ہونے والی تھی اس سے پہلے دوسری بچی مردہ پیدا ہوئی تھی اور وہ پانچوں وقت کی نماز کے بعد بیٹے کی ولادت کی دعا کرتی تھی۔ مقررہ تاریخ سے پندرہ دن پہلے' اس کی چھوٹی جیٹھانی رشیدہ نعمان بیگ کے ساتھ کراچی آ گئی تھیں اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ عمر میں بڑی ہونے کے باوجود عتیقہ کا نام نہیں لے رہی تھیں بلکہ اسے نہایت احترام سے ''میڈم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں، انہوں نے عتیقہ کو بستر پر بٹھا دیا تھا تمام کام دوڑ دوڑ کر وہ عورت خادماؤں کی طرح کر رہی تھی جیسے یہ سب کر کے اسے خوشی ملتی ہو...... ایک دن اکیلے میں ان سے میں نے پوچھا کہ وہ عتیقہ کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہیں اور اسے بجائے عتیقہ کے میڈم کیوں کہتی ہیں...... تو وہ مسکرا کر بولیں۔

''اس لئے کہ میڈم کا کوئی میکہ نہیں ہے۔ ایسے موقعوں' پر عورت کو ماں اور میکے کی کمی محسوس ہوتی ہے...... اور میڈم اس لئے کہتی ہوں کہ ہم تو نرے جاہل ہیں لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ اتنی پڑھی لکھی اور اتنی پیاری لڑکی ہماری دیورانی ہے، ہم سب کو فخر سے بتاتے ہیں کہ ہمارے نعمان کی بیوی ایم اے پاس ہے''۔

ایک دن نعمان بیگ عتیقہ کو ڈاکٹر کے پاس سے چیک اپ کروا کے گھر لائے تو میں نے یونہی پوچھ لیا ''نعمان بھائی آپ مستقل کراچی میں کیوں نہیں رہتے؟'' اس پر وہ افسردگی سے بولے۔

''میں تو رہنا چاہتا ہوں لیکن آپ کی سہیلی نہیں چاہتیں، بلکہ میرے بھائی تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ لوگ بھی یہیں آ جائیں ہم سب مل کر رہیں، میں اس گھر کو تین منزلہ بنانا چاہتا ہوں لیکن آپ کی دوست ایسا نہیں چاہتیں کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور میرا خاندان بالکل ان پڑھ ہے ظاہر ہے ان کا گزارہ ہماری فیملی کے ساتھ ہونا ممکن نہیں'' نعمان بیگ کے لہجے میں افسردگی تھی۔

تب میں نے عتیقہ کو سمجھایا کہ وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کرے' ٹھیک ہے وہ لوگ تعلیم یافتہ نہیں لیکن انسان بہت اچھے ہیں' محبت کرنے والے لوگ ہیں' لیکن عتیقہ نے کسی بات پر کان نہیں دھرا، یہ اس کی سب سے بڑی خامی تھی کہ وہ صرف خود کو عقل کل سمجھتی تھی باقی سب احمق اور بے وقوف تھے لیکن اسے اپنی خامی کا احساس تک نہیں تھا تین دن بعد عتیقہ نے ایک اور بیٹی کو جنم

دیا، میں جب اسے دیکھنے اسپتال پہنچی تو اسکی جیٹھانی بچی کو گود میں لئے اسے شہد چٹا رہی تھیں، عتیقہ آنکھیں بند کئے پڑی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیئے کو بھگو رہے تھے، میں نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی، میں جانتی تھی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

''دیکھئے آپ ہی سمجھایئے جب سے بچی کا سنا ہے روئے جا رہی ہیں، بچی کو دیکھا تک نہیں، بیٹا یا بیٹی ہونا کوئی انسان کے ہاتھ میں تو نہیں ہے'' عتیقہ کی جیٹھانی نے مجھ سے کہا۔

''چپ رہو تم رشیدہ بھابی، تم ایسا اس لئے کہہ رہی ہو کہ پورے آٹھ بیٹوں کی ماں ہو اگر تم بھی بیٹیاں پیدا کرتیں تو تمہیں پتہ چلتا کہ عورت بیٹی کی ماں بن کر خود کو کتنا کمزور اور بے وقعت محسوس کرتی ہے'' عتیقہ نے سارا غصہ اپنی جیٹھانی پر اتار دیا۔

وہ بے چاری چپ چاپ بچی کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں تو میں نے نعمان بیگ کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تب عتیقہ نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ بیٹی کی خبر سن کر حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ وہ اپنا دکھ اپنے بھتیجوں کے ساتھ بانٹیں گے۔ مجھے اس دن نعمان بیگ پر بہت غصہ آیا اور عتیقہ کی بدقسمتی پر رونا کہ وہ اگر اتنی تلخ تھی تو اس کی ان گنت وجوہات بھی تھیں۔

بیٹی کا نام عتیقہ نے حمیرہ رکھا اور آہستہ آہستہ اسے قبول کر لیا'۔ لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ دوسری بیٹی کی پیدائش کے بعد نعمان بیگ کا کراچی آنا بہت کم ہو گیا تھا کیونکہ وہ بیٹے کی کمی شدت سے محسوس کرتے تھے، شاید عتیقہ بیٹے کی ماں ہوتی تو اس کی زندگی مختلف ہوتی!

عتیقہ نے ابھی سوا مہینہ بھی نہیں نہایا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا، انتقال والے دن نعمان بیگ اور ان کے تمام رشتے دار کراچی آ گئے تھے اور وہ خود بھاگ بھاگ کر تمام کام کر رہے تھے، عتیقہ کی تینوں جیٹھانیاں گھر میں یوں کام کر رہی تھیں جیسے یہ انہی کی ذمہ داری ہو رشیدہ بھابی بطور خاص عتیقہ اور ننھی بچی کا خیال رکھ رہی تھیں، تعزیت کے لئے آنے والوں میں میری ملاقات یاسمین سے بھی ہوئی جو میری یونیورسٹی کی دوست تھی وہاں اس سے یہ پتہ چلا کہ وہ نہ صرف عتیقہ کی بچپن کی دوست ہے بلکہ اس کی محلے دار بھی رہی ہے، ہم دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک یاسمین کے منہ سے نکلا

’’ایسا باپ خدا کسی کو نہ دے جو اولاد کا دشمن ہو...... کاش بڑے میاں عتیقہ کی شادی سے پہلے مر جاتے تو آج اس کی زندگی کا رنگ کچھ اور ہوتا‘‘

’’کیا کہہ رہی ہو‘‘؟ میں نے چپکے سے تنبیہ کی

وہ جواب میں مجھے وہاں سے اٹھا کر کمرے سے باہر لے آئی اور دکھ بھرے لہجے میں بولی’’ تمہیں کیا پتہ صنوبر، عتیقہ کتنی بدقسمت ہے اور ساتھ ہی کتنی ہمت والی کہ دکھوں کے سمندر میں ڈوبی رہی لیکن اف تک نہ کی، اس کی جگہ میں ہوتی تو شاید خودکشی کر لیتی...... ماں کو اپنے حسن اور تعلیم کا زعم تھا اور باپ روایتی اور کنجوس شوہر کی حیثیت سے بیوی پر حکومت کرنا چاہتے تھے اور اس کھینچا تانی میں بچے رُل گئے، لیکن ماں باپ دونوں نے بیٹے کو بھرپور پیار دیا اور سارے زمانے کی محرومیاں سگے ماں باپ نے صرف عتیقہ کے مقدر میں بھر دیں، اس کی ہر لحاظ سے کمتر خاندان میں صرف اس لئے شادی کر دی کہ اپنے رہنے کا ٹھکانہ بنا رہے کیونکہ کوئی اور انہیں رکھنے پر آمادہ نہیں تھا‘‘۔

’’لیکن شادی تو رفیعہ اور اس کے میاں نے کروائی تھی شاید جلن اور حسد کا مادہ کارفرما تھا‘ میں نے اسے بیچ میں روک کر کہا۔

’’ٹھیک کہہ رہی ہو وہ دونوں بھی اس سازش میں شریک تھے بلکہ اس کے بھائی اور بھاوج بھی کیونکہ ان سب کو کینیڈا جانا تھا اس لئے قرعہ فال بدنصیب عتیقہ کے نام نکلا کہ ایسے شخص اور خاندان میں شادی ہو جو ہر لحاظ سے ان سے نیچا ہوتا کہ جہیز نہ دینا پڑے اور ساتھ ہی بڑے میاں بیٹی داماد کے ساتھ بھی رہ سکیں اور دھیلا خرچ کئے بغیر خدمت بھی کرواتے رہیں، ورنہ عتیقہ کے تو کئی اچھے اچھے رشتے آئے مگر لالچی اور خودغرض باپ نے کوئی منظور نہ کیا‘‘

’’اور ماں بھی کچھ نہ بولیں‘؟‘ میں نے جاننا چاہا

’’نہیں! وہ عتیقہ کو نجانے کیوں بالکل پسند نہیں کرتی تھیں اور اپنے میکے میں مگن رہتی تھیں۔ ان کی چہیتی رفیعہ اور ان کا بیٹا تھے‘ وہ تو عتیقہ کی تعلیم کے بھی خلاف تھیں‘ بیچاری نے ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اپنی تعلیم مکمل کی ہے‘‘

''لیکن یاسمین، نعمان بیگ اور ان کا خاندان ان پڑھ ضرور ہے، جاہل اور بدتمیز نہیں مجھے تو نعمان بھائی میں کوئی خامی نظر نہیں آئی، پھر ان کے عزیزوں کو دیکھو کیسی بے لوث خدمت کرتے ہیں اور عتیقہ کو میڈم کہہ کر بلاتے ہیں، لیکن اس کا رویہ تو سب کے ساتھ بہت خراب ہے! اسے تم کیا کہو گی؟ میں نے سوال کیا

''میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں! اور شاید تم یہ نہیں جانتیں کہ میں نے اسی رویے کی وجہ سے عتیقہ سے ملنا بہت کم کر دیا ہے''۔

''کیا مطلب؟ میں چونکی

''دراصل نعمان بھائی نے عتیقہ کی خاطر خود کو بہت بدلا ہے، انہوں نے اپنا لب ولہجہ بالکل تبدیل کر لیا، شادی کے وقت وہ صرف میٹرک تھے اور اب دو سال پہلے انہوں نے بی کام سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ہے''۔

''اچھا...... یہ سب تو مجھے پتہ نہیں تھا'' میں نے تعجب کا اظہار کیا

''اور اب وہ انہیں جاپان بھیج رہی ہے'' یاسمین نے انکشاف کیا

''مگر کیوں'' میں چونکے بغیر نہ رہ سکی!

''بس...... تاکہ وہ فخریہ یہ کہہ سکے کہ اس کا شوہر باہر کمانے گیا ہے''

''اور نعمان بھائی مان گئے'' میں نے پوچھا

''کیسے نہ مانتے، وہ تو پہلے دن سے احساس کمتری کا شکار ہیں، اوپر سے عتیقہ کا ہر لحہ بڑھتا ہوا تکبر اور غرور خود عتیقہ کے لئے مسائل پیدا کر رہا ہے، میرا اسی بات پر اختلاف ہے کہ جو کچھ اسے والدین سے ورثے میں ملا ہے اسے اپنی اولاد کو منتقل نہ کرے لیکن وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں بلکہ اب تو بیٹی بھی باپ اور ددھیال والوں کو برا بھلا کہتی ہے''۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کچھ دنوں بعد میں نے گھر تبدیل کر لیا، افراسیاب کو میں نے اپنے کالج سے قریب اسکول میں داخل کرا دیا۔ واپسی پر اسے لیتی ہوئی گھر آتی تھی اس طرح عتیقہ سے ملنا کم ہو گیا لیکن وہ اکثر

موقعوں پر میرے پاس آ جاتی۔ نعمان بیگ جاپان جا چکے تھے۔ اس کا اسکول ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا ،وہ جب بھی آتی ایک دو دن میرے پاس ٹھہر جاتی۔ وی سی آر پہ اپنی پسند کی فلمیں دیکھتی اور بہت خوش رہتی۔ میں نے اب اسے سمجھانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے یہ بات پسند نہ تھی، میرے میاں اس کی بچیوں کا بے حد خیال رکھتے کہ کہیں انہیں باپ کی عدم موجودگی کا احساس نہ ہو، لیکن ماں بیٹیاں نعمان بیگ کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتی تھیں، عتیقہ کا کہنا تھا کہ شوہر کو جاپان بھیج کر ایک طریقے سے اس نے اپنے سسرال والوں سے پیچھا چھڑایا ہے جو ہر ماہ آن دھمکتے تھے اس نے برملا یہ بات ان لوگوں سے کہہ دی تھی کہ اب وہ لوگ صرف اُسی وقت آئیں جب نعمان جاپان سے واپس آ جائیں۔

اور یہ بات حرف بہ حرف اس طرح پوری ہوئی کہ دو سال کے بعد نعمان بیگ واپس تو آئے، لیکن تابوت میں بند ہو کر ......!!ان کی میت آنے کے بعد عجیب منظر تھا۔ نعمان بیگ کے بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور اتنی ہی شدت سے مدیحہ اپنی تائی اور تایا پہ برس رہی تھی، جبکہ عتیقہ بالکل خاموش تھی، میں نے کمرے میں جا کر اسے سمجھایا کہ اپنی بیٹی کو کنٹرول کرو، اگر اس وقت عقل سے کام نہ لیا تو بالکل تنہا رہ جاؤ گی کیونکہ یہ جیسے بھی ہیں، انسان بہت اچھے ہیں، لیکن یہ سن کر عتیقہ بولی کہ ''جو اس کی بیٹی کر رہی ہے وہ ٹھیک ہے کیونکہ وہ ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ یاسمین نے عتیقہ کی جیٹھانیوں کو سمجھانا چاہا تو سب سے بڑے تایا بولے۔

''بہن ہم تو ان کے رویئے کے عادی ہیں انہیں کہنے دیجئے، جو کہتی ہیں، لیکن یہ ہمارا خون ہیں ہم انہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے ورنہ قیامت کے دن نعمان دامن گیر ہو گا''۔

چھوٹی جیٹھانی رشیدہ جو ایک سلجھی ہوئی عورت تھی، بولی

''آپ فکر نہ کریں، ہم سمجھتے ہیں کہ جو غم ان پر ٹوٹا ہے اس میں یہ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں انہیں اپنا ہوش نہیں ہے''۔

اس پر مدیحہ غصے سے بولی...... ''ہم نے ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، سارا پیسہ تو ہمارے ابو کا کھا لیا اب کیا تابوت بھی لے جانے کا ارادہ ہے تاکہ اس کی لکڑی سے تصویروں کے

فریم بنا کر مہنگے داموں بیچ سکیں"۔

تمام لوگ ہکا بکا ہو کر چودہ سالہ لڑکی کی شکل دیکھنے لگے جو جسم، اطوار اور زبان سے بیس بائیس سال کی لگ رہی تھی اور عتیقہ چپ چاپ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب میں نے اور یاسمین نے عتیقہ کے گھر جانا بہت ہی کم کر دیا تھا کیونکہ اس کی دونوں بیٹیاں ہمارا آنا پسند نہیں کرتی تھیں ہم دونوں ہی انہیں ددھیال والوں سے رویہ درست کرنے کے لئے کہتے تھے' کیونکہ ان لوگوں نے اب تک رشتہ نہیں توڑا تھا۔ عید بقرعید پر باقاعدہ عیدی اور جوڑے لے کر آتے تھے لیکن ادھر وہی بے حسی بدتمیزی اور خودسری تھی، ہماری آمد پر وہ عتیقہ سے لڑتی تھیں' یہ ہم نے محسوس کر لیا تھا ایک دن یاسمین نے تنگ آ کر کہہ دیا۔

"عتیقہ تم نے دو سانپ پیدا کی ہیں یہ تمہیں جیتے جی مار رہی ہیں اور تم خود اس کی ذمہ دار ہو اگر تم وہ نفرتیں' جو تمہیں اپنے والدین سے ملی تھیں ان کا زہر نعمان بیگ اور اس کے خاندان کو منتقل نہ کرتیں تو آج یہ لڑکیاں تمہارے کہنے میں ہوتیں"۔

وہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی اور دونوں بیٹیاں کمرہ بند کر کے ٹی وی دیکھتی رہیں اور پھر اس کے بعد نہ عتیقہ آئی اور نہ میں اس کے گھر گئی بس کبھی کبھار اس کا فون آ جاتا کہ اس کا جی تو بہت چاہتا ہے لیکن لڑکیاں آنے نہیں دیتیں، اور پھر فون پر ہی پتہ چلا کہ وہ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہو گئی ہے۔

اور ایک دن مدیحہ کا فون آیا کہ امی کی طبیعت بہت خراب ہے وہ آپ کو یاد کر رہی ہیں، میں پہلی فرصت میں اس کے گھر پہنچی تو وہ اپنے زخمی پیروں پر پولی فیکس لگا رہی تھی۔ دونوں بیٹیاں حسب عادت کمرے میں بند ٹی وی دیکھ رہی تھیں وہ مجھے دیکھ کر رونے لگی اور بولی:۔

"صنوبر تم اور یاسمین ٹھیک کہتی تھیں' میں ہی غلطی پر تھی۔ میں نے نعمان بیگ جیسے نیک اور شریف شخص کا جی بھر کے مذاق اڑایا بلکہ اسے ہر طرح سے ذلیل کیا لیکن اب سوچتی ہوں کہ حمیرہ اور مدیحہ اپنے رشتہ داروں سے ملیں"

"کاش عتیقہ تم نے اپنی جیٹھانی رشیدہ کی بات مان لی ہوتی تو آج مدیحہ اپنے گھر کی ہوتی"۔

میں کہے بغیر نہ رہ سکی

''صرف مدیحہ ہی نہیں بلکہ حمیرہ بھی' انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے کوئی سے دو بیٹے لے لوں، اپنی مرضی سے لکھاؤں پڑھاؤں اور پھر انہیں بیٹے سے داماد بنالوں! لیکن میں نے انہیں اور نعمان کو خوب ذلیل کیا کہ کیا میری بیٹیاں جاہل خاندان کی بہوئیں بنیں گی؟......اور آج کوشش کے باوجود مدیحہ کا کہیں رشتہ نہیں ہو رہا کیونکہ اس کی بدتمیزی زبان درازی اور خودسری کے قصے محلے میں عام ہیں وہ دونوں اب میرے کنٹرول سے باہر ہیں بلکہ مجھے ہر کام ان دونوں کی مرضی سے کرنا ہوتا ہے''۔ وہ رونے لگی......

میں نے تسلی دی کہ جو ہوا سو ہوا لیکن اب بھی وقت ہے......تمہاری سوچ میں جو تبدیلی آئی ہے وہ بہت اچھی ہے جلدی ہی اس پر عمل کر ڈالو۔

''اسی لئے تو تمہیں بلایا ہے'' وہ بولی

''کیا مطلب میں کچھ سمجھی نہیں''

''میں چاہتی ہوں تم ان دونوں کو سمجھاؤ''......اس نے حسرت سے کہا

''میں سمجھاؤں؟......وہ تو مجھے پسند ہی نہیں کرتیں' مجھے دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیتی ہیں اسی لئے میں نے آنا چھوڑ دیا''......میں نے وضاحت کی

''لیکن وہ تم سے ڈرتی بھی ہیں''......اس کے لہجے میں التجا تھی

''ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں'' یہ کہہ کر میں ان دونوں کے پاس کمرے میں گئی ۔دونوں بستر پہ پڑی نمکو کھا رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں، میں نے ایک ٹھیک ٹھاک لیکچر انہیں دیا جسے انہوں نے خاموشی سے سنا میں نے عتیقہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ان کے سامنے رکھا اور پھر عتیقہ کی خواہش کا ذکر کیا تو چھوٹی حمیرہ جو اب پندرہ سال کی تھی اور مدیحہ سے زیادہ تیز طرار تھی بولی۔

''دیکھیں آنٹی آپ کی تمام باتیں صحیح ہیں، لیکن آپ مجھے یہ بتایئے کہ ہم نے پیدا ہو کر یہی سنا ہے کہ حیدرآباد والے بہت برے ہیں' وہ گنوار ہیں جاہل ہیں' اور ہم بہت برتر ہیں۔ ہماری امی جو

رمضان اور عید بقر عید پر تمام محلے میں کھانے گوشت اور افطاری بانٹتی ہیں وہی حیدرآباد والوں کو پانی کا گلاس پلانے کی روادار نہیں، وہ لوگ عیدی لے کر آتے ہیں اور سوکھے منہ جاتے ہیں، ہمارے ذہنوں میں شروع سے یہ بات ڈال دی گئی کہ نعمان بیگ بہت کمتر انسان تھے اور ان کے رشتہ دار صرف اس لئے ہم سے ملتے ہیں کہ ہمارے اسکول اور ہمارے گھر پر قبضہ کر کے ہمیں دربدر کر دیں۔ ایسا امی ہمیشہ کہتی آئی ہیں ...... تو بتایئے کہ ایک لمحہ میں سب کچھ بھلا کر ہم کیسے انہیں گلے لگالیں''۔ وہ چپ ہوئی تو مدیحہ بولی،

نانا کی اور ابو کی برسی پہ امی سو سو لوگوں کو کھانا کھلاتی ہیں لیکن حیدرآباد والے کھانے کے وقت پہ بھی آتے تو انہیں بھوکا جانا پڑتا تھا، مجھے کبھی کبھی یہ بات بری لگتی تھی اور میں کچن میں جا کر کچھ پکانے کی تیاری کرتی تو امی فوراً کہتیں۔

''آ گئیں کچن میں، ہاں بھئی گھٹنے پیٹ کی طرف ہی جھکیں گے''

آپ ہی بتایئے برسوں کی پیدا کی ہوئی نفرت کو ہم ایک جھٹکے میں کیسے ختم کر دیں''

میں چپ چاپ اٹھ کر عتیقہ کے پاس آ گئی اور اسے پوری کتھا سنا دی، جواب میں وہ رونے لگی کہ وہ وہی کاٹ رہی تھی جو بویا تھا!!

میں نے کہا ''عتیقہ اگر بنیاد کی ایک اینٹ ٹیڑھی ہو تو پوری دیوار ٹیڑھی بنتی ہے۔ مستری اگر ماہر ہے تو دیوار کے ٹیڑھے پن کو محسوس کر کے اسے دور کر دیتا ہے بصورت دیگر پوری کی پوری عمارت ٹیڑھی بنتی چلی جاتی ہے''

تین دن بعد اطلاع ملی کہ عتیقہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ایک بار پھر نعمان بیگ کے تمام رشتہ دار جمع تھے اور چالیسویں تک رہے لیکن اس دفعہ ان سے بدتمیزی کرنے اور انہیں ذلیل کرنے میں مدیحہ کے ساتھ ساتھ حمیرہ بھی پیش پیش تھی، جو بو کر گندم کاٹنے کی امید رکھنا حماقت نہیں ہے تو کیا ہے؟

✠✠✠✠✠✠✠

''بیوٹی پارلر''

ہفتے کی رات میں اور باسط نارتھ ناظم آباد کے ایک ہوٹل سے کھانا کھا کر باہر آئے اور ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہو کر یونہی باتیں کرنے لگے کہ اچانک ایک لمبی سی سفید چمچماتی کار ہمارے قریب آ کر رک گئی اور پچھلی سیٹ پر سے ایک بھاری بھرکم خاتون کاندھے پہ مفلر نما دوپٹہ ڈالے گہرے میک اپ میں اتریں اور خوشگوار لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

''ارے تہنی باجی آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟......!! میں صغریٰ ہوں'' ایک لمحے کو تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ سچویشن کیا ہے پھر اچانک ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے اسے پہچان لیا۔

''ارے تم صغریٰ ہو؟ ماسی زینب کی بیٹی صغریٰ''

اس کا چہرہ کچھ اتر سا گیا کیونکہ موجودہ خاتون اور اسکول کی چپراسن ماسی زینب کی بیٹی صغری میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

کہاں رہتی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟ اور یہ کون ہیں؟ اس نے باسط کی طرف اشارہ کر کے پوچھا

''سوسائٹی میں رہتی ہوں ایک اخبار میں کام کرتی ہوں اور یہ میرے میاں باسط علی ہیں''

''آؤ گاڑی میں بیٹھو میں بھی بہادر آباد کی طرف جا رہی ہوں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دوں گی''...... وہ محبت سے بولی

''نہیں ہم چلے جائیں گے آپ زحمت نہ کیجئے'' باسط نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''ارے واہ بھائی جان تکلف کیسا' ہم دونوں بچپن کی سہیلیاں ہیں۔ سانگھڑ میں ہمارے گھر پاس پاس تھے اور ہم نے پڑھا بھی ایک ہی اسکول سے ہے...... آیئے'' اس نے اشارہ کیا اور باوردی ڈرائیور نے اگلا دروازہ باسط کے لئے کھول دیا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تو میں بھی پچھلی سیٹ پہ صغریٰ کے ساتھ بیٹھ

گئی' جہاں پہلے ہی ایک طرحدار اور پر کشش لڑکی بیٹھی تھی۔

''بیٹی ہے تمہاری'' ......میں نے اخلاقاً پوچھا

''بیٹی ہی سمجھو......ویسے یہ میری بھانجی ہے'' وہ بولی اور میں گنگ اس کے باوردی ڈرائیور اور اس کی کلائیوں کو دیکھ رہی تھی جن میں درجن بھر سونے کی موٹی موٹی چوڑیاں تھیں اور دونوں ہاتھوں میں فیروزے اور عقیق کی ٹھوس انگوٹھیاں۔ ماضی کے دریچوں سے ایک دبلی پتلی سانولی لڑکی جھانک رہی تھی جو روزانہ ہمارے گھر سے بچا کھچا کھانا لینے آتی تھی اور میں ازراہ ہمدردی اچار چٹنی اور دو چار پھل بھی اس کی باسکٹ میں ڈال دیتی تھی اور ایسا کر کے مجھے ایک تسکین کا احساس ہوتا تھا، لیکن اس وقت میں شدید فرسٹریشن کا شکار تھی۔

''یہ میرا کارڈ رکھیں اور میرے گھر آنا ضرور'' اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا نہایت اعلیٰ درجے کے قیمتی اور خوبصورت کاغذ پر اس کا پتہ لکھا تھا۔ وہ ڈیفنس میں رہتی تھی، لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا وہ یہ تھی کہ کارڈ پر اس بیوٹی پارلر کا پتہ درج تھا جس کا تذکرہ پچھلے دنوں تواتر سے ہمارے اخبار کے دفتر میں ہوتا رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ناظم آباد کے ایک معمولی سے بیوٹی پارلر کی لاتعداد شاخیں کھل گئی ہیں، کوئی جگہ شہر کی ایسی نہ تھی جہاں اس پارلر کے بڑے بڑے جہازی سائز کے اشتہاری بورڈ نہ لگے ہوں، اخبارات کے اشتہارات الگ تھے، پروپرائیٹر کی جگہ جو نام لکھا تھا وہ تھا مسز یاسمین حسن!۔

''یہ کس کا نام ہے''؟ میں نے پوچھا

''باجی میں نے اپنا نام بدل لیا ہے، صغریٰ نام میرے میاں کو پسند نہیں تھا، اور حسن میرے شوہر کا نام ہے'' اس نے بے پروائی سے کہا

میں نے بھی اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر دیا جس میں میرے اخبار کا مونوگرام بنا ہوا تھا، اسی اثناء میں سوسائٹی کا قبرستان آ گیا' باسط نے گاڑی روکنے کو کہا تو صغریٰ بولی'

''کہاں ہے گھر آپ کا''؟

''گھر تو غوثیہ مسجد والی گلی میں ہے دائیں جانب، لیکن آپ یہیں اتار دیجئے' کیونکہ آپ کو بہادر آباد جانا ہے'' باسط نے سنجیدگی سے کہا

''نہیں بھائی جی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ کو سڑک پر اتار دوں، ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ مجھے اپنا گھر نہ دکھانا چاہیں'' وہ ہنس کر بولی

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں' میں تو آپ کے خیال سے کہہ رہا تھا'' باسط نے بھی ہنس کر جواب دیا اور ڈرائیور کو دائیں طرف مڑنے کو کہا

گاڑی گھر کے قریب پہنچی تو وہ بولی:-

''یہ جگہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ وہ سامنے والے بنگلے کے میجر صاحب اکثر ہمارے گھر آتے ہیں۔ ان کی بیگم سے میری بڑی دوستی ہے' وہ اپنی بھنویں، بال، میک اپ، غرض ہر کام کے لئے ہمارے پارلر آتی ہیں'' صغریٰ نے دومنزلہ مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ میں نے اسے گھر میں آنے کو کہا تو اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس کی بھانجی کو دیر ہو رہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

میں گھر پہنچی تو بہت اپ سیٹ تھی، میرا دل کسی سے بھی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا، بس ایک ہی خیال مجھے جکڑے ہوئے تھا کہ میں اور باسط دونوں کام کرتے ہیں پھر بھی اب تک اپنا ذاتی گھر نہیں بنا پائے، ہماری بڑی بیٹی شادی کے قابل ہو چکی تھی، ہم دونوں بڑی شدت سے بچت کر رہے تھے، اگر کہیں باسط کے بھائی کا یہ گھر نہ ہوتا' جو کینیڈا میں مقیم تھے' تو ایک بہت بڑی رقم کرائے کی نذر ہو جاتی پھر بھی ہم اتنی رقم اکٹھی نہ کر پائے تھے کہ دھوم دھام سے بیٹی کی شادی کر سکتے، اور یہاں ایک چپراسن کی بیٹی آج جس روپ میں مجھے ملی تھی اس نے مجھے شدید ڈیپریشن اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا، میرے اندر کی عورت یکدم چھلانگ مار کر باہر آ گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میری تعلیم، لیاقت، قابلیت اور شجرہ نسب مجھے وہ سب دینے میں کیوں ناکام رہے' جو صغریٰ کو مل گیا؟ لیکن کس طرح؟؟ بس یہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا اور میرے سامنے وہ دن بکھرے ہوئے تھے جب اسکول میں اپنے بیگ سے میں بسکٹ اور چاکلیٹ نکال کر ہمیشہ صغریٰ کو دیتی تھی کیونکہ اسے یہ سب میسر نہ تھا۔ اس کا باپ ٹی بی کا مریض تھا...... دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے، اس کی فیس اس لئے معاف تھی کہ میرے والد نے اس کی سفارش کی تھی، اس کی ماں ایک محنتی عورت تھی' ایمانداری سے کام کرتی تھی اور اسکول کی چپراسن تھی، اسکول

کے بعد وہ ہمارے گھر آ جاتی اور گھر کا بیشتر کام سنبھال لیتی تھی۔ دونوں وقت کا کھانا ماں بیٹیاں ہمارے گھر کھاتی تھیں، اور ساتھ لے کر بھی جاتی تھیں۔ صغریٰ شکل صورت کی اچھی تھی، رنگ ٹھیک ٹھاک گورا تھا کچھ بھی پہن اوڑھ لیتی تھی اچھی لگتی تھی میرے تمام استعمال شدہ کپڑے امی اسے ہی دیدیتی تھیں، اسے پڑھنے کا قطعی شوق نہ تھا لیکن میرے سمجھانے اور زبردستی کرنے پر اس نے میٹرک کرلیا تھا، پڑھائی کے برعکس اسے جنس مخالف میں زیادہ دلچسپی تھی، اکثر میں نے اسے شیدا قصائی اور وڈیرے کے نوکر کے ساتھ دیکھا تھا، میں اسے سمجھاتی تو وہ مسکرا کر کتارا منہ میں رکھتی اور بھاگ جاتی، ہمارے گھر میں بھی اس کی کوشش یہ ہوتی کہ آ کا بھائی کا کمرہ وہ صاف کرے لیکن دادی شکرے کی سی نگاہ رکھتی تھیں جب بھی وہ بھیا کے کمرے میں جانے کا ارادہ کرتی دادی جان اسے آواز دے کر بلالیتیں اور کہتیں کہ وہ ان کی ٹانگیں دبائے، صفائی اس کی ماں کرے گی، اسی اثناء میں سنا کہ اس کی شادی ہورہی ہے۔ وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی اور بتایا کہ اس کے ماں باپ اس کا رشتہ فضل دین سے کررہے ہیں جو تین بچوں کا باپ ہے اور جس کی بیوی گذشتہ سال زچگی میں مرگئی ہے۔ پیسہ اس کے پاس بہت ہے بس اسی لئے وہ خوشی خوشی شادی پر راضی ہیں اور پھر ایک دن اس کی ماں نے امی اور دادی کو بتایا کہ صغریٰ کی ایک ہفتے بعد شادی ہے۔ وہ روتی دھوتی ادھیڑ عمر فضل دین کی بیوی بن کر چلی گئی، اسی اثناء میں میرا داخلہ حیدر آباد کے ایک گرلز کالج میں ابو نے کروادیا، میں وہیں ہوسٹل میں مقیم ہوگئی اور یوں صغریٰ سے رابطہ ختم ہوگیا۔ والد نے زمینیں بیچ کر کراچی سیٹل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور میں آخری بار جب سانگھڑ گئی تو صغریٰ میرے آنے کا سن کر بھاگی چلی آئی، اس کی گود میں تین مہینے کا بچہ تھا۔ وہ خاصی مطمئن نظر آرہی تھی۔ میں نے جب فضل دین اور اس کے بچوں کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک کراہت سے بولی ،باجی جب وہ اپنی بھینسوں سے لاڈ پیار کرکے میرے پاس آتا ہے تو وہ مجھے بھی بس ایک بھینسا ہی لگتا ہے، کم بخت کے بدن سے مکھن اور دہی کی بو آتی رہتی ہے"...... پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی...... "جب آدمی من کو ہی نہ بھائے تو روپیہ پیسہ بھی زہر لگتا ہے" بس یہ تھی آخری ملاقات ......اچانک مجھے یاد آیا کہ اس کے میاں کا نام تو فضل دین تھا، یہ حسن کیسے ہوگیا۔!!

☆☆☆☆☆☆☆☆

دوسرے دن دفتر میں جب میں نے فریدہ، حمیرہ، عباس اور نعمان کو صغریٰ کے بارے میں بتایا تو چاروں کام چھوڑ کر میری ٹیبل پر آ گئے، عباس کا خیال تھا کہ مجھے افسانے کے لئے ایک نیا پلاٹ مل گیا اور بقیہ کا کہنا تھا کہ یہ کوئی بڑا گینگ ہے جس کا ہیروئن کا کاروبار ہے ورنہ کسی بھی دوسرے کام میں انسان کی کینچلی اس طرح نہیں بدل جاتی اس شبہے کو تقویت اس بات سے بھی ملی کہ صغریٰ کو اپنا اور اپنے میاں کا نام بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

لیکن نعمان بولا ''ایسے لوگ اپنے جاننے والوں کو سب کچھ کھل کر نہیں بتاتے' اس نے آپ کو مختصری ملاقات میں سب کچھ کیوں بتا دیا''؟۔

''سب کچھ کہاں بتایا...... بس یہی تو کہا کہ اسے اپنے ماں باپ کا رکھا ہوا نام پسند نہیں تھا'' ...... میں نے نعمان سے کہا اور فوراً ہی اس کا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کے گھر کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف کسی ماسی نے فون اٹھایا اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو چند لمحے بعد صغریٰ فون پر تھی۔

''کیسی ہیں باجی جی، میں بھی آپ کو یاد کر رہی تھی، کبھی آئیں نہ میرے گھر'' اس نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کر لیں''

''دراصل میں خود تم سے ملنا چاہ رہی ہوں بیس سال کے بعد تم سے ملاقات ہوئی بھی تو برائے نام...... تم ایسا کرو کہ کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ' خوب باتیں کریں گے''۔

میں نے کہا

''ٹھیک ہے باجی جی میں بھی کسی روز ضرور آؤں گی' لیکن آپ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر اس لئے پہلے آپ آئیں گی پھر میں آؤں گی' اس نے خوشدلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے تو کل بارہ اور ایک کے درمیان میں آ رہی ہوں لیکن ذرا اپنا پتہ اچھی طرح سمجھا دو''

''آپ فکر نہ کریں میرا ڈرائیور آپ کو گھر سے لے لے گا' اور ہاں بھائی جان اور بچوں کو بھی ساتھ لائیے گا''

''نہیں صغریٰ میرا مطلب ہے یاسمین ابھی تو میں اکیلی ہی آؤں گی تم سے ڈھیر ساری باتیں جو کرنی ہیں''۔ میں نے کہا

''چلیں جیسی آپ کی مرضی'' بس فرصت سے آیئے اور پورا دن میرے ساتھ گذاریئے گا۔ مجھے بہت اچھا لگے گا'' اس نے پیار سے کہا

''دراصل وہ تمہیں مرعوب کرنا چاہ رہی ہے''..........فریدہ نے کہا

''بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا......ایسے لوگ جنہیں اچانک کہیں سے دولت مل جائے وہ سب سے پہلے ان لوگوں کو اس کا جلوہ دکھانا چاہتے ہیں جو ان کے ماضی سے واقف ہو'' عباس نے گرہ لگائی۔

اور میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ سانگھڑ کی جھونپڑی سے ڈیفنس تک کا سفر صغریٰ نے کس طرح اور کس کے سہارے طے کیا ہوگا؟

☆☆☆☆☆☆☆

اسی دن رات کو جب میں نے باسط سے صغریٰ کے ہاں جانے کا ذکر کیا تو وہ حسب عادت ہنس کر بولے:

''تمہیں وہاں ضرور جانا چاہیئے کیونکہ تم صحافی بھی ہو اور افسانہ نگار بھی ......تمہارے لئے وہاں بہت کچھ ہوگا''

دوسرے دن، ساڑھے گیارہ بجے، صغریٰ کا باوردی ڈرائیور میرے لئے گاڑی لئے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے لئے ایک پرفیوم خرید لی تھی مجھے یاد تھا وہ جب میرے کپڑے استری کرتی تو کتنی کتنی دیر تک انہیں گلے سے لگا کر، سونگھتی رہتی تھی اور پھر بڑی حسرت سے پوچھتی :

''باجی جی یہ خشبو بہت مہنگی آتی ہوگی نہ''

''پتہ نہیں صغریٰ میں نے تو کبھی خریدی نہیں، بھائی جان کویت سے بھیج دیتے ہیں''۔

میں کہتی، اور کبھی کبھار شینل 5 عید بقرعید پر یا کسی تقریب پر، اسے بھی لگا دیتی تھوڑی دیر بعد ہم ڈیفنس میں داخل ہوئے، جہاں پل کے ایک طرف کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے، جن کے پیٹ کمر سے لگے تھے۔ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر جا بجا نظر آرہے تھے جہاں سے افغانی بچے، کاغذ اور پلاسٹک چُن رہے تھے اور گاڑی جب دوسری سمت داخل ہوئی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ زمزمہ پر، گرلز کالج کے قریب وسیع وعریض پارک تھا جہاں بیگمات کی جاگنگ، بچوں

کی گاڑیوں اور آیاؤں کے لئے الگ جگہ تھی جس کی تعمیر ابھی جاری تھی اور میرا دل، جو ہمیشہ ایسے مناظر دیکھ کر باغی ہو جاتا ہے، سوچ رہا تھا کہ کیا یہی قائداعظم اور لیاقت علی خان کے خوابوں کی تعبیر ہے جہاں ساری مراعات، ساری سہولتیں سارا عیش وعشرت صرف اور صرف افواج پاکستان، یا اسمگلروں کے لئے مخصوص ہے؟ اچانک گاڑی ایک دومنزلہ بنگلے کے سامنے جا کر رک گئی جس کا رنگ راجستھانی اینٹوں کی طرح سرخ تھا۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا تو سامنے ورانڈے میں صغریٰ فیروزی کاٹن کے سوٹ میں کھڑی تھی...... اس نے خود کار کا دروازہ کھولا اور ہمیشہ کی طرح ''باجی جی'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ لان سے گذر کر جب ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو عین توقع کے مطابق وہ بھی جدید ساز وسامان، قیمتی ایرانی قالین اور کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس سے سجا بنا کسی شوروم کا نقشہ پیش کر رہا تھا جیسا کہ عام طور پر نو دولتیے خاندانوں میں نظر آتا ہے، جنہیں جدید اصطلاح میں اب برگر فیملیز کہا جاتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے آئی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ سانگھڑ کی صغریٰ جو فضل دین کی بیوی تھی اس کی کایا پلٹ کیونکر اس طرح ہوئی گویا سورج مغرب سے نکل آیا ہو۔ میری بات سن کر وہ مسکرائی اور اپنی انگلیوں میں پڑی موٹی موٹی انگوٹھیوں کو گھماتے ہوئے بولی...... ''بس باجی جی اللہ کا بڑا کرم ہے، ہم نے ایک بیوٹی پارلر کھولا اور اللہ میاں نے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا''...... اچانک مجھے یاد آیا کہ میں اس کے لئے شینل 5 کا گفٹ لائی تھی، میں نے بیگ کھول کر اسے گفٹ دیا تو اس نے شکریہ کہہ کر اسے لمبی چوڑی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا، جہاں شینل 5 کی فیملی سائز بوتل کے علاوہ، کوبرا، بروٹ اور دیگر پرفیومز کی شیشیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کو اپنا آپ مجھے چھوٹا محسوس ہوا اور میں سوچنے لگی کہ ناحق میں نے پیسے ضائع کئے۔ دراصل پرفیوم خریدتے وقت میں بھول گئی تھی کہ جس صغریٰ کے ہاں میں جا رہی ہوں، وہ سانگھڑ کی جھونپڑی میں رہنے والی کمی کاری نہیں بلکہ مسز یاسمین حسن ہے۔

''باجی جی آپ بھی ایک بیوٹی پارلر کھول لیں...... ایمان سے بس دو تین لڑکیاں رکھ لیں، ایک مہینے میں لکھ پتی بن جائیں گی'' اچانک اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا'' لیکن صغریٰ یہ بات

سمجھ میں نہیں آتی کہ فضل دین اپنا آبائی کاروبار چھوڑ کر اچانک کیسے کراچی آبسا؟......اور پھر......

''باجی فضل دین تو اب بھی وہیں ہے'' اس نے میری بات اچک لی۔

''کیا مطلب'' مجھے جھٹکا سا لگا

اسی وقت ملازمہ نے آ کر بتایا کہ کلفٹن والے پارلر سے فون ہے کوئی میجر سجاد بات کرنا چاہتے ہیں' اپنی بیگم کے سلسلے میں، صغریٰ نے بیڈ روم کا فون اٹھایا اور نہایت توجہ سے بات سننے کے بعد بولی، ''آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی' آپ آٹھ بجے آجائیں''۔ اور فون بند کر دیا' پھر ملازمہ سے بولی ''دو تین گھنٹے تک مجھے کوئی کال نہ دینا میری باجی آئی ہیں''۔ پھر ملازمہ کے جانے کے بعد آہستہ سے بولی :

''باجی جی میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی کہ ماسی زینب کی بیٹی کس طرح یاسمین بنی؟۔ میں چاہتی تو آپ کو اس دن دیکھ کر گذر جاتی کیونکہ میں کبھی نہیں چاہتی کہ کوئی بھی مجھے بیس سال پہلے والی' صغریٰ کی حیثیت سے پہچانے، آپ کو بھی اگر میں نہ بتاتی تو آپ بھی مجھے کبھی نہ پہچان سکتیں''

''ہاں یہ تو ہے' میں تو تمہیں ہرگز نہ پہچان پاتی، مگر تم نے کیوں ایسا کیا کہ جب سب تمہیں مسز یاسمین حسن کے نام سے جانتے ہیں تو تم خود اپنے ماضی کی شناخت دہراؤ'' میں نے کہا'' بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے باجی جی' لیکن میرے اندر جو شریف ماں باپ کا خون ہے' وہ ہمیشہ ان احسانات کو یاد رکھتا ہے' جو آپ نے مجھ پر کیے' اگر آپ زبردستی نہ کرتیں تو میں کبھی میٹرک پاس نہ کرتی، آپ ایک ہی تو سہیلی تھیں میری جو مجھے واقعی اپنی سکھی سمجھتی تھیں اور برابری کا سلوک کرتی تھیں' جبکہ اسکول کی دوسری لڑکیاں ہمیشہ یہ سوچ کر مجھ سے دور دور رہتی تھیں کہ میں چپراسن کی بیٹی ہوں''

''حیرت ہے تمہاری سوچ پر'' میں نے تعجب سے کہا'' یہاں تو دولت ملتے ہی لوگ اس طرح کینچلی بدل لیتے ہیں کہ اپنے سگوں کو رشتہ دار ماننے سے انکاری ہو جاتے ہیں''۔

''خیر چھوڑیں یہ بات...... ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ فضل دین اب بھی وہیں سانگھڑ میں ہے اور اب وہ میرا شوہر نہیں ہے، میں نے دوسری شادی کر لی ہے اور میرے میاں کا نام رشید

حسن ہے جو پہلے پولیس میں تھا لیکن کچھ عرصے پہلے یہ نوکری چھوڑ دی۔ آج کل سنگاپور گیا ہوا ہے ورنہ میں آپ سے ملواتی''۔

''مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ صغریٰ'' میں نے بے چینی سے کہا

اس نے سنبھل کے دو تکیئے میری جانب بڑھائے'' آپ ایزی ہو جایئے'' وہ بولی اور پھر کہنے لگی۔

''باجی جی میں جو بتا رہی ہوں اسے کسی سے کہنا مت...... دراصل میرا خود بھی دل چاہ رہا ہے کہ آپ کو سب کچھ بتاؤں''

''تم بے فکر رہو صغریٰ ہم صحافیوں کے سینے سمندر ہوتے ہیں'' میں نے کہا

''جب میری شادی فضل دین سے ہوئی تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، شیدا قصائی مجھے بہت چاہتا تھا لیکن وہ اچانک گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس عرصے میں میں ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ ہر روز رات کو میں دودھ میں افیون ملا کر فضل دین کو پلا دیتی تھی جس سے میری جان بچی رہتی تھی۔ فضل دین کے بچوں کو البتہ میں نے پریشان نہیں کیا...... اسی عرصے میں اُس کی بڑی بیٹی جمیلہ نے مجھے بتایا کہ شیدا واپس آ گیا ہے اور اس نے پولیس میں نوکری کر لی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ اپنے باپ کی دوکان پر بیٹھنے کے بجائے اسکول جاتا تھا''

''ہاں مجھے یاد ہے بلکہ ایک بار اس نے ابا میاں سے بھی اپنی سفارش کرنے کو کہا تھا'' مجھے سب یاد آ گیا۔

''بس واپس آ کر ایک دن اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور بولا کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے اور وہ میرے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود اپنی زندگی سے عاجز تھی البتہ ابا اماں اور دونوں بھائی مزے میں تھے...... تب میں نے ایک فیصلہ کر لیا!...... آخر مجھے بھی تو اپنی زندگی اپنے طریقے سے اور اپنی مرضی سے جینے کا حق تھا، میں نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا، وہ پولیس میں تھا' اس نے اپنے ایک ساتھی کو بلایا اور مجھے اس کے ساتھ حیدر آباد روانہ کر دیا۔ اس رات میں نے شیدے کی لائی ہوئی نیند کی دوا' دودھ میں گھول کر سب کو پلا دی اور ایک پرچہ چھوڑ آئی کہ'' مجھے ڈھونڈا نہ جائے' میں خودکشی کرنے جا رہی ہوں کیونکہ میرے ماں

باپ نے میری خوشی کا خیال کئے بغیر میرا سودا کیا تا کہ خود مزے کر سکیں'' ......

''اور تمہارا بیٹا؟ اس کا کیا ہوا؟ میں نے اچانک پوچھا

''وہ بھی وہیں ہے'' اس نے لاپرواہی سے کہا

'تم اسے یاد نہیں کرتیں یا تمہیں اس کو چھوڑنے کا افسوس نہیں ہوا''

''میں تو اسے جنم دینا ہی نہیں چاہتی تھی۔ دائی خیراں سے جب میں نے مدد چاہی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کمزور بہت ہوں اور ایسا کرنے سے' جان کا خطرہ ہے''

''تم اکیلی حیدرآباد آئیں شیدا ساتھ کیوں نہیں آیا''

''وہ اس لئے باجی جی کہ اگر وہ میرے ساتھ آتا تو سب کو یقین ہو جاتا کہ میں شیدے کے ساتھ بھاگی ہوں ...... تین چار دن کے بعد' جب معاملہ دب گیا اور سب نے مجھے رو پیٹ کر صبر کر لیا تو شیدا میرے پاس حیدرآباد پہنچ گیا' اور وہیں میرا نکاح رشید حسن یعنی شیدے سے ہو گیا''

''فضل دین سے طلاق لئے بغیر'' میں نے حیرت سے پوچھا

''باجی جی کیا نکاح اور کہاں کی طلاق ...... نکاح دو دلوں کے ملن کا نام ہے۔ میں نے نکاح کو نہ تو قبول کیا تھا اور نہ ہی میں نے نکاح کے لئے ''ہاں'' کی تھی بلکہ مجھ سے تو کسی نے بھی پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی گویا مجھے بیچا گیا تھا...... اور جب میں نے نکاح کے لئے حامی ہی نہ بھری ہو تو وہ تو زنا بالجبر ہوا...... تو پھر طلاق کس بات کی''؟

''تم تو بڑی گہری باتیں کر رہی ہو؟ کیا تم نے آگے بھی تعلیم حاصل کی؟''

''زمانہ سب سے بڑا استاد ہے' البتہ کچھ عرصہ پہلے میں نے انگریزی کی ٹیوشن ایک کرسچن عورت سے لی تھی کیونکہ ہمارے پروفیشن میں انگریزی کی بڑی ضرورت پڑتی ہے''

''پھر تم کراچی کب آئیں''

''ہم لوگ دو سال بعد ہی یہاں آ گئے تھے پھر کچھ عرصہ بعد رشید حسن کے دو ساتھیوں کے ساجھے سے ناظم آباد میں ایک بیوٹی پارلر کھولا اور پھر باجی جی' اللہ میاں نے وہ برکت دی کہ آپ دیکھ ہی رہی ہیں''

''شیدے...... میرا مطلب ہے رشید حسن سے کتنے بچے ہیں تمہارے''؟

''اے لو'' وہ ہنس کر بولی ''میں نے اب تک آپ کو یہ بھی نہیں بتایا...... باجی میرے تین بچے ہیں ایک بیٹا دو بیٹیاں، بیٹیوں کی شادی کردی ایک کا میاں ڈاکٹر ہے اور دوسری کا کمپیوٹر انجینئر، اور بیٹا مری میں پڑھ رہا ہے اگر گیارہ ستمبر والا حادثہ نہ ہوتا تو وہ اب تک امریکہ جا چکا ہوتا''

اسی وقت ملازمہ نے آکر کہا ''آنٹی زرینہ کا فون ہے انہیں میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ کہہ رہی ہیں کہ بات کرنا بہت ضروری ہے، انہوں نے آپ کے موبائل کو بھی ٹرائی کیا تھا لیکن شاید آپ نے موبائل آف کیا ہوا ہے''

وہ اچانک اٹھی اور کہنے لگی ''میں ابھی آئی'' اور کمرے سے باہر چلی گئی جبکہ فون اس کے بیڈ روم میں بھی موجود تھا۔ میں اس کی غیر موجودگی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سامنے دیوار پر صغریٰ اور شیدے قصائی کی بہت بڑی تصویر نہایت نفیس فریم میں جڑی ہوئی تھی جس میں وہ راجستھانی اسٹائل کی ساڑھی باندھے بالوں میں موتیا لگائے کھڑی تھی اور اس کے ساتھ شیدا قصائی یعنی رشید حسن' تھری پیس سوٹ پہنے کھڑا تھا!! اور میں سوچ رہی تھی کہ ہمارے معاشرے میں' ایسے نہ جانے کتنے شیدے اور صغریٰ اپنی کینچلی بدل کر باعزت بنے گھوم رہے ہوں گے اور ہر جگہ اگلی صفوں میں' بچھے صوفے ان کے لئے خالی رکھے جاتے ہوں گے۔

''معاف کرنا باجی جی' وہ ڈی آئی جی صاحب کی بیگم کا فون تھا' انہیں پرسوں کسی کالج کی تقریب میں جانا ہے اس لئے کل ویکسنگ کروانی ہے' اور میک اپ بھی کروانا ہے۔ آپ تو صحافی ہیں' اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان لوگوں کو ناراض کر کے کوئی شریف بندہ کاروبار نہیں کر سکتا'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا' تھوڑی دیر بعد جب میں نے اس سے اجازت لی تو اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے ایک سرخ مخملی ڈبیا نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی'' باجی جی ہمیشہ آپ ہی نے دیا ہے آج پہلی بار خدا نے مجھے اس قابل کیا ہے کہ آپ کو کوئی تحفہ دے سکوں''

میں نے مستطیل ڈبیا کھول کر دیکھا تو اس میں ایک سنہری چین' جگمگا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

باوردی ڈرائیور مجھے گھر واپس چھوڑنے جا رہا تھا تو میرا ذہن اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کس

طرح ایک بیوٹی پارلر کھول لوں اور اپنی بیٹی کو نہایت شان وشوکت سے بیاہ سکوں' یہی سوچتے سوچتے گھر آ گیا، میں خیالوں ہی خیالوں میں اپنے مالی حالات کے متعلق سوچتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تو باسط آ چکے تھے اور بچے کیبل پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے' میں نے خوشی خوشی باسط کو سونے کی چین دکھائی تو آ ہستگی سے بولے'' کیا جواب میں تم بھی اسے اتنا قیمتی تحفہ دے سکو گی؟'' ہمیشہ میں نے ہی اُسے دیا ہے آج پہلی بار اس نے مجھے کوئی چیز دی ہے''۔ میں نے جل بُھن کر کہا، باسط نے میرا موڈ آف کر ڈالا تھا۔ دو تین دن میں یہی سوچتی رہی کہ مکان کے نچلے حصے میں یا تو کرایہ داروں سے ایک کمرہ واپس لے لیا جائے یا پھر اوپر ہی کی منزل میں وہ کمرہ جو ذرا الگ تھلگ تھا اور اسٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اسے کام میں لے آؤں، جب باسط سے تذکرہ کیا تو انہوں نے رُکھائی سے کہا۔

'' جو چاہو کرو کیونکہ تم کرو گی وہی جو تم نے طے کر لیا ہے ...... لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ چاہے شروع میں صرف چھ کرسیوں اور دو آئینوں سے کام شروع کرو لیکن جو لڑکیاں رکھو گی انہیں دو تین مہینے اپنی جیب سے تنخواہ دینی ہوگی''۔

واقعی یہ بات معقول تھی شروع میں تو کسی بھی کاروبار سے منافع کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے ،اگلے دن جب میں دفتر پہنچی تو نعمان مجھے دیکھتے ہی بولا''

'' تہنیت وہ شاہد ملک نئے ڈی آئی جی کرائم ہو گئے ہیں''

'' اچھا، میں نے خوشی سے کہا'' وہ بہت فرض شناس انسان ہے' یہ تبدیلی اچھی ہے''

ابھی ہم سب باتیں کر ہی رہے تھے کہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے مجھے طلب کر لیا میں ان کے کیبن میں پہونچی تو انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر بولے:

'' تہنیت میں نے سنا ہے نئے ڈی آئی جی کرائم شاہد ملک کو آپ بہت اچھی طرح جانتی ہیں''

'' جی ہاں سر جانتی ہوں، دراصل طالب علمی کے زمانے میں آپ ہی کے اخبار کے صفحات پر وہ اور میں مستقل کالم لکھا کرتے تھے۔ اس وقت ناصر صاحب طلبہ کے صفحے کے انچارج ہوا کرتے تھے، اور یہ بھی اتفاق ہے کہ اس وقت کے بیشتر لکھنے والے آج اچھے عہدوں پر ہیں، اس کے

علاوہ ریڈیو کے بزم طلبہ پروگرام میں بھی بے شمار دفعہ میں نے اور شاہد نے ساتھ ساتھ حصہ لیا ہے''

''یہ تو بہت اچھا ہوا، اب آپ کو شاہد صاحب کا انٹرویو کرنا ہے اپنے اخبار کے لئے، آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ان کا انٹرویو ہمارے اخبار کو خاصا فائدہ پہنچا سکتا ہے''۔

''جی بالکل...... آپ فکر ہی نہ کیجئے میں ارینج کرلوں گی...... بس آپ کو اتنا کرنا ہے کہ ان سے وقت اور دن طے کروا دیجئے''

''مگر کیوں؟...... جب آپ کی جان پہچان اتنی پرانی ہے تو آپ خود فون پر بات کیوں نہیں کر لیتیں'' انہوں نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

''سر بات یہ ہے کہ اگر میں نے رابطہ کیا تو وہ سمجھے گا کہ مجھے اس سے کوئی کام ہے اور یہی میں نہیں چاہتی، کیونکہ کسی کو جب کوئی عہدہ ملتا ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ لوگ اپنا کام نکالنے کے لئے اس سے تعلقات بڑھا رہے ہیں''۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے، پھر آپ کبھی نہ کبھی تو اس سے ملی ہوں گی'' انہوں نے کہا

''یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد میں اس سے کبھی نہیں ملی کیونکہ میرا مزاج اس معاملے میں ذرا مختلف ہے، آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پی ٹی وی میں میرے تین کلاس فیلوز پروڈیوسر ہیں اور ایک ساتھی مدتوں ''نیلام گھر'' کرتا رہا لیکن خواہش کے باوجود میں نے ان لوگوں سے رابطہ نہیں کیا ''

''بڑی عجیب نیچر ہے آپ کی...... خیر چھوڑیئے میں خود وقت لے لوں گا' بس آپ نعمان کو اور ایک فوٹو گرافر کو ساتھ لے جایئے گا''۔

''بہت بہتر سر'' میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ آئی۔

اگلے ہی دن ایڈیٹر صاحب نے شاہد ملک سے ایک ہفتے بعد کا وقت لے لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ہفتے وہ بہت مصروف ہیں' کچھ کالی بھیڑوں اور جرائم پیشہ افراد کی سرکوبی کے لئے انہیں یہاں تعینات کیا گیا ہے۔

مقررہ دن جب میں نعمان اور فوٹو گرافر ریاض کے ہمراہ' شاہد ملک کے دفتر پہنچی تو وہ مجھے

دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور بے تکلفی سے بولا:

''ارے تہنیت تم!...... مجھے تمہارے ایڈیٹر صاحب نے بالکل نہیں بتایا کہ میرا انٹرویو تم کرو گی''

''اگر وہ تمہیں بتا دیتے تو کیا تم انٹرویو نہ دیتے''

میں نے ہنس کر پوچھا

''نہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر ...... تمہارے افسانے تو پڑھتا ہی رہتا ہوں لیکن یہ نہیں پتہ تھا کہ تم با قاعدہ صحافی بن گئی ہو''......

اس نے خوشدلی سے کہا

اس نے نہایت اچھی چائے اور پیٹیز ہمارے لئے منگوائے، پھر انٹرویو شروع ہوا، دو چار رسمی سوالات کے بعد، نعمان نے پوچھا کہ وہ ڈی آئی جی کرائم بننے کے بعد، خاص طور سے کن باتوں کی طرف توجہ دے رہے ہیں تو شاہد کہنے لگا:

''بات یہ ہے کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ شہر میں بے شمار فحاشی کے اڈے کئی با اثر افراد کی سرپرستی میں چل رہے ہیں، میری پہلی ترجیح ان اڈوں کی بیخ کنی کرنا ہے''۔

''مگر اس طرح تو نہیں جیسے ایوب خان نے بازار حسن پر پابندی لگا دی تو گھر گھر فحاشی کے اڈے کھل گئے تھے'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا:

''نہیں ...... بالکل نہیں .... بلکہ تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میرا کام انہی گھر گھر کھلنے والے اڈوں کا صفایا کرنا ہے ...... ابھی پرسوں ہم نے ایک نرسنگ ہوم پر کامیاب چھاپہ مارا جو بظاہر نرسنگ ہوم تھا لیکن اصل میں کچھ اور ...... اڈے کے مالک سمیت کئی لڑکیوں کو بھی حراست میں لیا...... لیکن گرفتاری کے آدھے گھنٹے بعد ہی بڑے بڑے لوگوں کے ٹیلی فون آنے لگے...... اب تم ہی بتاؤ کہ ہم کیا کریں''؟

''تو کیا آپ نے ان سب کو چھوڑ دیا'' نعمان نے پوچھا

''چھوڑنا پڑا مجبوراً...... کیونکہ دو ٹیلی فون تو آپ کے منتخب نمائندوں کے تھے'' شاہد ملک نے تلخی سے کہا:

''پھر تم کرپشن کس طرح ختم کر سکتے ہو''؟ میں نے پوچھا:

''دیکھو کوشش تو کر رہا ہوں ...... لیکن اس سلسلے میں مجھے صحافیوں کا تعاون بھی درکار ہے کیونکہ آپ لوگ ہر طرح کا الزام پولیس والوں پر لگا کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں' یہ نہیں سوچتے اور نہ یہ جاننے کی زحمت کرتے ہیں کہ ذمہ دار اور ایمان دار افسران کو ان کے فرائض کی بجا آوری سے کون روکتا ہے۔ یہ بھی تو ایک المیہ ہے' لیکن اس کے بارے میں کوئی نہیں لکھتا، اسی وجہ سے عوام سارا ملبہ ہم پولیس والوں پر ڈال دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دو تین دن بعد میں دفتر میں بیٹھی شاہد ملک کے انٹرویو کو آخری ٹچ دے رہی تھی تاکہ اسے کمپوزنگ کے لئے دے سکوں کہ فون کی گھنٹی بجی، ریسیور اٹھایا تو شاہد تھا، کہنے لگا، جتنی جلدی ممکن ہو میرے آفس پہنچ جاؤ' بڑا ضروری کام ہے دیر نہیں ہونی چاہیئے'' ...... میں حمیرہ کو بتا کر فوراً نکل آئی' البتہ اپنا کیمرہ ضرور اٹھا لیا جسے میں وقتِ ضرورت ہمیشہ ساتھ رکھتی تھی، رکشہ فوراً ہی مل گیا' میں جیسے ہی اس کے آفس میں پہنچی تو لگا وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا، دیکھتے ہی کہنے لگا۔

''تمہاری دوستوں میں اب بدنام زمانہ عورتیں بھی شامل ہو گئی ہیں''؟

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں نے گھبرا کر پوچھا :

''ادھر آؤ میرے ساتھ'' ...... وہ بولا اور اپنے آفس سے ملحق' ایک کمرے میں داخل ہو گیا' میں بھی اس کے پیچھے چلتی چلی گئی، کمرے میں پہنچی تو میرے قدم وہیں رک گئے جہاں تھے ......

صوفے پر یاسمین حسن بیٹھی موبائل پر کسی سے باتیں کر رہی تھی، مجھے رکتا دیکھ کر شاہد ملک بولا ...... ''رک کیوں گئیں قریب آؤ، اپنی دوست سے ملو جو بیوٹی پارلر کی آڑ میں برسوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ فحاشی کا اڈہ چلا رہی ہیں ...... ان کا کہنا ہے تم ان کی بچپن کی ساتھی اور بہترین دوست ہو ...... مجھے یقین نہ آتا لیکن جب اِنھوں نے تمہارا وزیٹنگ کارڈ نکال کر دکھایا تو مجھے یقین کرنا پڑا'' شاہد ملک نے میز پر رکھے ہوئے متعدد کارڈز میں سے میرا وزیٹنگ کارڈ اٹھا کر مجھے دکھایا۔

''ہاں یہ کارڈ میں نے ہی اسے دیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کی بچپن کی سہیلی ہوں......
لیکن میں نے یہ کارڈ یاسمین حسن کو نہیں بلکہ صغریٰ کو دیا تھا جو اسکول کی ماسی زینب کی بیٹی تھی''......
میں نے کہا

''بقیہ تعارف میں مکمل کیئے دیتا ہوں'' شاہد نے کہا ''ان کے بارے میں اطلاعات تو تھیں لیکن ثبوت ہاتھ نہیں لگ رہے تھے، جب ہمیں ثبوت مہیا ہو گئے تو کل ہم نے ان کے کلفٹن اور ڈیفنس والے اڈوں پر چھاپہ مارا جہاں ''مساج گھر'' کی آڑ میں بہت کچھ ہوتا ہے ان کے گاہک بڑے بڑے لوگ ہیں۔ان کا شمار شہر کی ''بہترین سپلائرز'' میں ہوتا ہے۔

یاسمین حسن نہایت بے پروائی سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کسی بھی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا، اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کی شرمندگی کے آثار نہیں تھے۔ اس کی بے نیازی مجھے بہت عجیب لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایک دو دن کے وقفے کے بعد میں صبح گیارہ بجے گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ کال بیل بجی، دروازہ کھولا تو سامنے یاسمین کھڑی تھی۔

''تم''!......میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''اب یہاں کیوں آئی ہو''؟

''گھبراؤ نہیں باجی جی'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی اور اندر آ گئی...... ''کچھ تو حقیقت آپ کو کل پتہ چل گئی اور آپ مجھ سے شدید نفرت بھی کرنے لگیں......لیکن بقیہ سچائی میں آپ کو بتانے آئی ہوں، کیونکہ جو میں بتانے آئی ہوں، وہ سچ نہ کسی اخبار میں ملے گا نہ شاہد ملک آپ کو بتائے گا''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟

اور اب باقی بھی کیا رہ گیا ہے معلوم ہونے کو، تمہارے ٹھاٹ باٹ کا راز بڑی دیر بعد میری سمجھ میں آیا،...... میں یہ سچائی فراموش کر بیٹھی تھی کہ جائز آمدنی سے کبھی کوئی راتوں رات امیر نہیں بنتا......'' میں نے تلخی سے کہا

''پانچ لاکھ میں ڈیل ہوئی ہے آپ کے شاہد ملک سے، تب اس نے میری لڑکیوں کو چھوڑا ہے، ان پانچ لاکھ میں کچھ حصہ ان کرائم رپورٹرز کا بھی ہے جو اپنا منہ بند رکھیں گے اور اپنے اپنے اخبار کو یہ خبر نہیں دیں گے''۔ اس نے انکشاف کیا۔

''کیا بک رہی ہو تم''...... میں نے غصے سے کہا ''شاہد ملک نہایت ایماندار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہے۔ اس نے شہر سے عیاشی کے اڈوں کو ختم کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ تمہیں اس پر الزام لگاتے شرم نہیں آتی''۔

اس نے اپنے بیگ میں سے ایک بہت چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا اور اسے آن کر دیا شاہد ملک کی آواز گونجی۔

''دیکھیے ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں، کرائم رپورٹر ایسی خبروں کی بو بہت جلد سونگھ لیتے ہیں انہیں بھی منہ بند رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا ورنہ وہ میرے خلاف ہی خبر لگا دیں گے''۔

''پانچ لاکھ ٹھیک رہیں گے''۔ یاسمین کی آواز سنائی دی۔

چلیئے آپ کی بات مان لیتے ہیں پھر ہمارے شیخ حمید سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں اور اب تو وہ وزیر بھی بن گئے ہیں لہذا ان کی بات بھی ماننی پڑے گی''۔ شاہد ملک نے جواب دیا۔

''شاہد صاحب' ہم احسان فراموش نہیں ہیں' ہم آپ کا آئندہ بھی ہر طرح کا خیال رکھیں گے۔'' جب آپ کا جی چاہے ڈیفنس اور کلفٹن والے مساج ہوم میں تشریف لائیے ہمارے پاس بالکل نئی مشینیں آئی ہیں''۔ یاسمین نے انکشاف کیا:۔

جواب میں شاہد ملک کا قہقہہ سنائی دیا'' واہ خوب' آپ نے نئی مشینوں کی اصطلاح کہاں سے سیکھی''۔

''بس جی' آپ جیسے بندہ پرور لوگوں کا کرم ہے ویسے یہ اصطلاح مجھے ایک ایس ایچ او نے بتائی تھی''' یاسمین نے بھی ہنس کر جواب دیا

ٹیپ بند کر کے وہ میری طرف دیکھنے لگی ''اب آپ کا کیا خیال ہے''؟

''تم نے یہ گفتگو کب اور کہاں ٹیپ کی اور یہ کیونکر ممکن ہوا'' میں نے تعجب سے پوچھا'

''باجی، آپ بڑی بھولی ہیں، آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ہر نیا آنے والا آفیسر اپنے ریٹ بڑھانے کے لئے ایسے چھاپے مارتا ہے اور ہم بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے، ہم بھی انہیں قابو میں رکھنے کے لئے ایسے ٹیپ ریکارڈر ساتھ رکھتے ہیں ...... لیکن آج تک اس کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہ لوگ ہمارا بہت ساتھ دیتے ہیں''

''اگر ایسا تھا تو اس نے مجھے کیوں بلا کر تم سے ملوایا اور تمہاری حقیقت بتائی''

میں نے سوال کیا!

''وہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے، اگر آپ میرے کاروبار کی ساتھی ہوتیں تو وہ آپ سے اپنی مرضی کی خبریں لگوا سکتا تھا، بصورت دیگر وہ خود کو ایک ایمان دار آفیسر ثابت کرتا جو کہ اس نے کیا'' ......وہ بولی

میں دفتر پہنچی تو شاہد ملک کے انٹرویو کا میٹر کمپوز ہو کر میری ٹیبل پر رکھا تھا تا کہ میں پروف دیکھ لوں۔ نعمان نے میری غیر موجودگی میں اس کی سرخیاں بھی نکال لی تھیں جو یہ تھیں:۔

''شاہد ملک ایک ذمہ دار، فرض شناس اور ایماندار پولیس آفیسر ہیں''

''وہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ شہر کو جسم فروشی کے تمام اڈوں سے پاک کر دیں گے''۔

✠✠✠✠✠✠✠

"آئینہ"

سفینہ، جب اس برانچ میں ٹرانسفر ہوکر آئی تو بہت خوش تھی، ایک تو اس لئے کہ گھر قریب ہوگیا تھا، دوسرے کام کرنے والے ساتھیوں کا روّیہ بہت اچھا تھا۔ اس برانچ میں تقریباً پچیس مرد اور چار خواتین تھیں جنہوں نے اسے بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہا تھا، دراصل اس کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ لوگوں میں جلد گھل مل جاتی تھی اور مردوں کو ہوّا سمجھنے کے بجائے، اپنے ہی جیسا ذی روح سمجھتی تھی، زمانہ طالب علمی میں بھی اس کے حلقہ احباب میں لڑکے اور لڑکیاں، دونوں شامل تھے۔ اس میں بلا کا اعتماد تھا جس کی وجہ سے لوگ اسے پسند بھی کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے۔ ماسٹرز کرنے کے بعد جب اس کا اپائنٹمنٹ مقامی بنک میں ہوا تو وہاں کا عملہ بھی مرد و خواتین پر مشتمل تھا لیکن اسے کسی سے کوئی بڑی شکایت نہیں ہوئی، چھوٹی موٹی باتیں اور معمولی اختلافات تو جاب کا لازمی حصہ ہوتے ہیں، وہ یہ جانتی تھی۔

شادی کے بعد بھی اس نے ملازمت جاری رکھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک سولہ سال کا اور دوسرا تیرہ سال کا، شوہر کسی پرائیویٹ ادارے میں پرچیز آفیسر تھے، وہ اپنی زندگی اور جاب دونوں سے مطمئن تھی کہ اچانک ٹرانسفر کے آرڈر آ گئے۔ وہ بہت پریشان ہوئی لیکن جب بینک مینیجر نے سمجھایا کہ موجودہ برانچ بند ہونے والی ہے اس لئے عملے کو دوسری برانچوں میں ایڈجسٹ کیا جا رہا ہے تو وہ خاموش ہوگئی۔ دوسری برانچ میں آکر دو تین دن بعد ہی اس نے لوگوں میں اپنی جگہ بنالی۔ دراصل وہ محنتی بھی بہت تھی، ہر کام وقت پر کرکے دینے کی عادت نے جلد ہی نئے بینک مینیجر اور سینئر ساتھیوں کی نظروں میں اسے ایک منفرد مقام دلا دیا۔ وہ کام تندہی، محنت اور جانفشانی سے کرتی لوگوں سے اخلاق سے ملتی ان کے کام آتی تھی۔ چپراسی سے لے کر بینک کے گارڈ تک سے، اس کا رویہ مشفقانہ تھا۔ وہ تھوڑے ہی دنوں میں مقبول ہوگئی تھی، لیکن ایک شخص تھا،

جو اسے مسلسل نظر انداز کرتا تھا' یہ تھا داؤد جو اس سے خاصا جونیئر تھا، ایسا لگتا تھا جیسے اسے سفینہ کا یہاں ٹرانسفر ہو کر آنا اچھا نہیں لگا، دراصل ایک مسئلہ اور بھی تھا' سفینہ کا ادبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حالات حاضرہ پر اس کی معلومات نہایت اچھی تھیں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر گفتگو کرتی تو لوگ اس کی علمیت اور قابلیت کے مزید قائل ہو جاتے، شاید یہی بات داؤد کو اچھی نہیں لگتی تھی، جب بھی لوگ اس کی ذمہ داری، خوش دلی اور جانفشانی کی تعریف کرتے' اس کے چہرے پر سائے سے لہرا جاتے' جسے سب ہی محسوس کرتے، پھر داؤد کے ساتھ ایک اور شخص کا روّیہ بھی ویسا ہی ہو گیا، سفینہ جیسے ہی بینک میں داخل ہوتی یا کوئی بات کرتی وہ دونوں آپس میں کُھسر پُھسر شروع کر دیتے۔ اسے بڑی کوفت ہوتی' اس کا جی چاہتا اسے کالر سے پکڑ کر کھڑا کر دے اور پوچھے '' تمہارا مسئلہ کیا ہے''؟...... لیکن وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکی...... پھر ایک دن اس نے فریدہ سے جب اس بات کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر بولی......'' میں بھی جب نئی نئی آئی تھی تو اس کا روّیہ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا تھا...... یہ دراصل ورکنگ ویمن کا دشمن ہے۔ یہ پہلے ہم لوگوں پر بھی جملے پھینکا کرتا تھا......اب کچھ سدھرا تھا' حیدر صاحب اور فیروز صاحب کے سمجھانے' پر دونوں بہت شائستہ اور سلجھے ہوئے لوگ تھے' بدقسمتی سے ایک انتقال کر گئے دوسرے ریٹائر ہو گئے...... لیکن تم کیوں اتنی اہمیت دے رہی ہو' دفع کرو کمبخت کو''

''لیکن یہ کیوں دشمن ہے ورکنگ ویمن کا'' سفینہ نے پوچھا

''اس کا تو کسی کو بھی علم نہیں بس یہ کہتا ہے کہ عورتوں کو گھر میں بیٹھنا چاہیئے' یہ جاب کر کے مردوں کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں''

فریدہ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے یہ یا تو کسی کمپلیکس کا شکار ہے یا اس کی تربیت صحیح نہیں ہوئی' کسی تنگ نظر مذہبی گھرانے کا لگتا ہے یا یہ نفسیاتی مریض ہے'' سفینہ نے جل کر کہا:-

☆☆☆☆☆☆☆
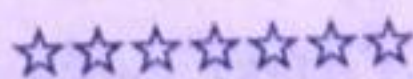
لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ دن بدن اس میں اضافہ ہوتا رہا، کبھی جملہ پھینکنا کبھی معنی

خیز تبسم، سفینہ میں اتنی ہمت تھی کہ اس کا دماغ درست کر دیتی لیکن اس کی ساتھی خواتین اسے روک لیتیں اور جب اس نے اقبال صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ نظر انداز کر دو، یہ نفسیاتی مریض ہے اور تمہاری مقبولیت سے جلتا ہے اور ہے بھی کچھ تنگ نظر جو عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں''

تب اس نے داؤد کو واقعی نظر انداز کرنا شروع کر دیا، لیکن وہ کسی نہ کسی طرح دو چار ملاحیاں' ملازمت پیشہ خواتین کو ضرور سنا دیتا تھا اور اس کے دوست طنزیہ سی ہنسی ہنس کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ آہستہ آہستہ سفینہ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا جبکہ وہ برابر دیکھتی اور محسوس کرتی تھی' کہ جب بھی مینیجر صاحب نے اسے اپنے چیمبر میں بلایا داؤد نے کھانس کر دوسروں کی توجہ اس جانب دلائی لیکن اس نے پرواہ کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا، گھر میں اس نے اپنے شوہر کو بھی کچھ نہ بتایا کہ خواہ مخواہ پریشان ہوگا، البتہ اس نے ویمن برانچ میں ٹرانسفر کروانے کی بات مینیجر صاحب سے ضرور کی، لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے صاف منع کر دیا' ایک تو وہ اتنی محنتی اور قابل ورکر کو کھونا نہیں چاہتے تھے، دوسرے ان کا کہنا تھا کہ خراب اور ناپسندیدہ روّیے سے دلبرداشتہ ہو کر' ٹرانسفر کروانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، سو وقتی طور پر سفینہ خاموش ہو گئی لیکن اس کا دل اب یہاں نہیں لگتا تھا۔ وہ بے چینی سے پانچ بجنے کا انتظار کرتی اور بینک کی عمارت سے باہر نکل کر اسے یوں لگتا جیسے مدتوں حبس اور گھٹن میں رہنے کے بعد اچانک تازہ ہوا میسر آئی ہے۔

کبھی کبھی اس کا جی بھر آتا، اس نے صرف نانا کی صورت میں شفیق مرد کی صورت دیکھی تھی، باپ کا جو ہولناک روپ اس نے بچپن میں دیکھا تھا وہ ایسا نہیں تھا' جس سے پیار بھری یادیں وابستہ ہوں، اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' ماں باپ کو آپس میں لڑتے ہی دیکھا تھا، اس کی ماں ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال عورت تھی اور اس نے اپنی مرضی سے سفینہ کے باپ سے شادی کی تھی۔ سفینہ کے نانا کا فیصلہ اپنی بیٹی کے حق میں تھا۔ لیکن اس کی نانی کا کہنا تھا کہ وحید ایک لالچی اور بدفطرت آدمی ہے شاید ان کی جہاندیدہ نظروں نے وحید کی بدنیتی کو پڑھ لیا تھا

لیکن خدا جانے وحید نے امینہ پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ کسی اور کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی، شادی کے بعد جب اوپر تلے دو بیٹیاں ہوئیں تو اس نے واویلا کرنا شروع کر دیا، اسے بیٹا چاہیئے تھا ورنہ اس کی نسل کیسے چلتی، پھر وہ دفتر سے لمبی لمبی چھٹیاں کرنے لگا' پرائیویٹ نوکری تھی' جلد ہی جواب مل گیا۔ اب اسے پلنگ توڑنے اور بیوی سے لڑنے کے سوا کوئی کام نہ تھا، امینہ جب نوکری کرنے کو کہتی وہ چلا کر کہتا۔

''کس کے لئے کماؤں تو تو بیٹیاں پیدا کئے جا رہی ہے''......اور اس وقت تک لڑتا رہتا جب تک امینہ باپ کے گھر سے کچھ روپے نہ لے آتی، پھر یوں ہوا کہ جب سفینہ چھ سال کی تھی تو راشد پیدا ہوا، لیکن وحید نے لڑنا اب بھی نہیں چھوڑا' وہ آئے دن امینہ کو بھیجتا تا کہ وہ کچھ رقم لا سکے، وہ ہچر مچر کرتی تو دونوں بیٹیوں کو بلاوجہ پیٹنا شروع کر دیتا اور اس وقت تک سفینہ اور میمونہ کو مارتا رہتا جب تک امینہ روتی ہوئی باپ کے گھر کے لئے روانہ نہ ہو جاتی۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

ایک دن دونوں میں اس بات پر لڑائی ہو رہی تھی۔ وحید پیسوں کا مطالبہ کر رہا تھا لیکن اس دن امینہ نے باپ کے گھر سے مزید رقم مانگ کر لانے سے صاف منع کر دیا اور کہہ دیا کہ اب وہ میکے جا کر ذلیل نہیں ہونا چاہتی، جب بھی وہ وہاں جاتی تھی ماں کی آنکھوں میں ایسی تحقیر ہوتی تھی کہ وہ تاب نہ لا پاتی، باپ بیوی کی نظر بچا کر کچھ نہ کچھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیتا۔ امینہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وحید اس لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ بھی ہے سب امینہ کا ہے۔

پھر بھی جب امینہ نے کسی بھی قیمت پر میکے جانے سے منع کر دیا تو وحید نے گالی دے کر کہا'' سالی جب تک بیٹیاں تھی تو چلی جاتی تھی، جب سے بیٹا ہوا ہے، بہت اکڑنے لگی ہے''...... بات پھر بھی نہ بنی تو وہ امینہ کو مارنے دوڑا' وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی، سفینہ کونے میں دبکی' سہمی ہوئی سب کچھ دیکھ رہی تھی، اچانک وحید نے بیوی کے بال پکڑ لئے اور چوٹی کو جھٹکا دے کر بولا:۔

''اگر باپ کے گھر سے کچھ لا نہیں سکتی تو اسی وقت یہاں سے چلی جا...... ورنہ میں خود تجھے دھکے دے کر نکال دوں گا''۔

وحید کی اس بات پر سفینہ کی ماں اچانک اٹھی اور ایک دوسرے ہی لہجے میں بولی؛

''گھر سے اگر جاؤ گے تو تم جاؤ گے...... کیونکہ یہ میرے باپ کا دیا ہوا گھر ہے''۔

یہ سنتے ہی جو جو تم بیزار ہوئی تھی' اس نے سفینہ کو سہا دیا تھا۔ وہ اور اس کی چھوٹی بہن اور بھائی' تینوں زور زور سے رونے لگے، چیخ پکار سن کر' پڑوسی بھی جمع ہو گئے۔ ماں ہچکیاں لے کر رو رہی تھی اور اس کا باپ بالکل جاہل اجڈ اور گنوار کی طرح بک جھک رہا تھا، تعلیم نے اس کا کچھ بھی نہ بگاڑا تھا' جب پڑوسیوں نے بھی اسے لعن طعن کی تو اچانک اس نے بیٹے کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا' دروازے کی طرف اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا' اور ایک لمحے کو رک کر بیوی کی جانب دیکھا اور غصے سے بولا:

''امینہ بیگم میں تجھے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں...... سالی بیٹے پہ اینٹھ رہی تھی...... لے میں اپنا بیٹا لے کر جا رہا ہوں...... ساری عمر تڑپتے رہنا اس کے لئے''۔

وہ یہ کہہ کر فوراً ہی راشد کو لے کر' دروازے سے باہر نکل گیا۔ آٹھ سالہ راشد اس صورت حال سے خوفزدہ لگ رہا تھا' لیکن وحید نے اسے نہ چھوڑا۔ وہ جاتے وقت مڑ مڑ کر آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا:-

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کے باپ کا پھر پتہ نہ چلا' لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ملتان سے کہیں باہر چلا گیا ہے کیونکہ جس مولوی کے پاس' راشد سیپارہ پڑھنے جاتا تھا' وہاں بھی وہ اس دن کے بعد سے نہیں آیا۔ امینہ نے دل پر پتھر رکھ کر' پھر سے زندہ ہونے کی کوشش کی اور نامناسب حالات کے باوجود اسکول میں پڑھا کر' ٹیوشنیں کر کے' اور گھر کے دو کمرے کرائے پر دے کر' اپنی بچیوں کو تعلیم دلائی، سفینہ کی زندگی شادی کے بعد یکسر بدل گئی۔ ناصر ایک سلجھا ہوا اور محبت کرنے والا انسان تھا، شادی کے چند سال بعد ہی اس کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا تھا، یہاں آ کر سفینہ نے بھی ایک بینک میں جاب کر لی تھی، ماں اور چھوٹی بہن اب بھی ملتان میں ہی تھیں۔ زندگی بہت سلیقے سے رواں دواں تھی۔ اب اس نے داؤد کی اوچھی حرکات کا نوٹس لینا بالکل چھوڑ دیا تھا لیکن اندر سے وہ خوش نہ تھی اور چاہتی

تھی کسی دوسری برانچ خصوصاً ویمن برانچ میں ٹرانسفر کروالے ،داؤد جیسے مردوں کی اندرونی خباثتوں سے اسے خوف آنے لگا تھا۔۔

ایک دن ناصر بہت خوش خوش گھر آیا اور اس نے سفینہ کو بتایا کہ اس کی کمپنی' تین سال کے لئے اسے سنگاپور بھیج رہی ہے۔ وہ سال میں ایک مرتبہ ایک ماہ کی چھٹی پر کراچی آ سکتا ہے،اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہاں سے کہیں آگے جانے کے بھی امکانات ہیں خاص کر امریکہ ......لیکن مسئلہ یہ تھا کہ فوری طور پر بیوی بچوں کو کس کے آسرے پر چھوڑا جائے' سو اس کا فوری حل اس نے یہ نکالا کہ اپنے چھوٹے بھائی کامران کو کراچی بلالیا' جو ابھی غیر شادی شدہ تھا،اور ساتھ ہی سفینہ کی ماں کو تمام صورت حال لکھ کر انہیں کراچی آنے کو کہا اور خود پندرہ دن کے بعد سنگاپور چلا گیا۔

ناصر کے جانے کے بعد سفینہ کے معمولات اب کچھ بدل گئے تھے۔ بچوں اور گھر' دونوں کی ذمہ داری اب اس کے کاندھوں پر آن پڑی تھی ،اس لئے وہ اب تقریباً ساڑھے نو بجے تک بینک پہنچ پاتی تھی۔

اس کے دیر سے' آنے کے ساتھ ہی داؤد اور اس کے حلقے کی سرگوشیاں بھی بڑھ گئی تھیں' اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کچھ اور لوگ بھی اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ایک صاحب جو پنج وقتہ نمازی تھے اسے دیکھتے ہی ایک دن بولے

''ہاں بھئی کسی کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اندر سے کیا ہے،لوگوں نے چہروں پہ نقابیں چڑھائی ہوتی ہیں''

دوسرے دن لنچ ٹائم میں کسی بات پر داؤد بولا

''میں تو سرے سے عورتوں کی تعلیم کا ہی مخالف ہوں بس اتنا پڑھنا لکھنا جانتی ہوں کہ بہشتی زیور پڑھ لیں اور ضرورت پڑنے پر مجازی خدا کو خط لکھ سکیں''

''آپ کی بیگم تو سنا ہے گریجویٹ ہیں'' فریدہ نے فقط گریجویٹ پر زور دے کر کہا

''جی ہاں...... ہیں تو...... لیکن یہ سب چونچلے شادی سے پہلے کے تھے،اب وہ ایک مکمل ہاؤس وائف ہیں''

''گویا باہر کی دنیا سے اب ان کا کوئی رابطہ نہیں وہ صرف کچن تک محدود ہو چکی ہیں اور غالبا بی اے کی ڈگری بھی کہیں رکھ کر بھول چکی ہوں گی''

شائستہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا

''بالکل...... عورت کی اصل دنیا کچن اور گھر ہی ہے باہر آ کر عورت فحاشی پھیلاتی ہے''

داؤد نے اپنے بڑے بڑے دانت نکال کر کہا

''کیا بک رہے ہیں آپ؟ کچھ احساس ہے آپ کو'' اچانک سفینہ غصے سے پھٹ پڑی

''جہاں نشیب ہوتا ہے وہیں پانی گرتا ہے'' داؤد نے پھر وار کیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا'' ذرا وضاحت تو کیجئے'' سفینہ نے دوبارہ کہا۔

لیکن داؤد جواب دینے کے بجائے معنی خیز مسکراہٹ سے سب کو دیکھتا ہوا واش روم کی طرف چل دیا، تہمینہ نے دیکھا کہ پہلے جو لوگ داؤد کو تنبیہ کرتے تھے وہ بھی آج چپ تھے...... پھر ایک دن مینیجر نے اسے بلا کر جب یہ کہا کہ وہ اگر چاہے تو اپنا ٹرانسفر کروا سکتی ہے تو وہ حیران رہ گئی کہ کل تک جو مینیجر اسے ٹرانسفر سے منع کر رہا تھا آج خود اسے چلے جانے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اپنی سیٹ پر واپس آ کر اس نے فریدہ اور شائستہ کو جب یہ بتایا تو دونوں مل کر مینیجر کے پاس گئیں اور جب کافی دیر بعد واپس آئیں تو ان کے چہرے اترے ہوئے تھے اور جب ان دونوں نے اسے بڑے کرب سے بتایا کہ اس کے کردار کے بارے میں آج کل بڑی مشکوک باتیں پھیل رہی ہیں کہ وہ شوہر کے جانے کے بعد بے راہ رو ہو گئی ہے اور گھر میں اجنبی لوگوں کا آنا جانا ہے۔ ایک لمحے کو تو وہ سناٹے میں آ گئی اتنی گری ہوئی بات کون کہہ سکتا ہے؟ اس نے جب مینیجر صاحب سے تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ اس قسم کی باتیں کافی دنوں سے پھیل رہی ہیں اور کئی لوگوں نے کہا ہے کہ تہمینہ کا ٹرانسفر کر دیا جائے ورنہ بینک کی بدنامی ہوگی کیونکہ اس کے گھر لوگوں کو آتے جاتے دیکھا گیا ہے ایک لمحے کو اسے ایسا لگا جیسے وہ پاتال میں گر گئی ہو لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ایک عزم اور حوصلے سے اس نے آنسوؤں کو پونچھا، مینیجر کو ساری تفصیل بتائی کہ کامران اس کا دیور ہے اور یہ سب خرافات یقیناً کسی نے جان بوجھ کر اس لئے پھیلائی ہیں کہ مرد حضرات عموماً

اس قسم کی باتوں پر نہ صرف آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے ہیں بلکہ مزے لے لے کر دوسروں کو بھی اس میں شریک کرتے ہیں، مینیجر کو اس سے ہمدردی تھی لیکن وہ کچھ مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، وہ غصہ میں بھری ہوئی اپنی سیٹ پر واپس آئی تین بج چکے تھے اس نے برملا وہ سب کچھ دہرا دیا جو سن کر آئی تھی، وہ لوگ جو اس کے پیچھے اس کے خلاف باتیں کرتے تھے اس وقت چپ چاپ چونچ پروں میں ڈالے بیٹھے تھے داؤد آج نہیں آیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سب کے گریبان پکڑ کر پوچھے کہ ''کیا تم بن ماں باپ کے پیدا ہو گئے ہو جو کسی بھی عورت پر تہمت لگانے سے پہلے نہیں سوچتے کہ وہ شریف عورت کسی کی ماں بھی ہے''۔ وہ غصے میں مسلسل پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ اچانک چپراسی نے اسے الگ لے جا کر بتایا کہ یہ سب باتیں داؤد کر رہا ہے اسے شک تو پہلے ہی تھا لیکن جب یقین ہو گیا تو وہ داؤد کا پتہ لے کر اپنے گھر پہنچی جہاں ماں اس کی منتظر تھی جو آج ہی ملتان سے کراچی آئی تھی، سفینہ ماں کو دیکھ کر بے قابو ہو گئی آنسوؤں کا سیلاب جو اس نے اپنے اندر سمیٹا ہوا تھا یکدم بہہ نکلا، وہ ماں کے کندھے پہ سر رکھ کر رونے لگی، روتے روتے اس نے ساری بات بتائی، ماں نے پوری کہانی سن کر اسے تسلی دی اور بولی

''بہتر ہے کہ تم تبادلہ کروالو...... اکیلی عورت کس کس سے لڑے گی، زیادہ اچھا یہی ہے کہ کسی ویمن برانچ میں چلی جاؤ''

''نہیں ماں، میں نہ تو اپنا ٹرانسفر کرواؤں گی اور نہ ہی چپ رہوں گی، تم اگر میرے ساتھ چل سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اکیلی ہی کامران کو لے کر داؤد کے گھر جا رہی ہوں''۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

سفینہ کامران اور ماں کے ہمراہ جب داؤد کے گھر پہنچی تو وہ ان تینوں کو دیکھ کر تھوڑا سا پریشان ہو گیا لیکن جلد ہی اپنی گھبراہٹ پہ قابو پا کر اس نے انہیں اندر آنے کو کہا، ہاتھ میں تسبیح بتا رہی تھی کہ وہ ابھی ابھی عصر کی نماز سے فارغ ہوا ہے۔

''جی فرمایئے آپ لوگوں نے کیسے زحمت کی''

اس نے تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے کہا

’’دراصل آج آپ آفس نہیں آئے اس لئے ہمیں مجبوراً آپ کے گھر بغیر اطلاع کے آنا پڑا کیونکہ کل تک انتظار کرنے کا وقت میرے پاس نہیں تھا‘‘ سفینہ نے ناگوار لہجے میں کہا۔

’’جی جی فرمائیے میں سن رہا ہوں‘‘ داؤد نے مہذب لہجے میں کہا

’’داؤد صاحب پہلے تو میں یہ بتادوں کہ یہ میری والدہ ہیں اور یہ کامران ہیں میرے شوہر کے سگے بھائی جنہیں وہ میرے پاس چھوڑ کر گئے ہیں...... اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہوں گی کہ جو بات میں آپ سے کرنے آئی ہوں وہ آپ کی بیوی کی موجودگی میں کروں...... ازراہ کرم آپ انہیں یہاں بلوا لیجئے‘‘ سفینہ نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا

’’خیر تو ہے؟...... ایسی کیا بات ہے‘‘؟ داؤد نے حیران ہو کر پوچھا

’’ہاں بیٹا بات کچھ ایسی ہی ہے کہ تمہاری بیوی کی موجودگی ضروری ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ سوچے کہ جب روز آفس میں ملاقات ہو جاتی ہے تو گھر آنے کی کیا ضرورت تھی...... وہ بھی بغیر اطلاع کے‘‘ سفینہ کی ماں نے کہا

داؤد چپ چاپ اندر گیا اور اپنی بیوی کو لے کر آ گیا خالص گھریلو عورت جو خاموشی سے چادر سر پہ ڈالے ایک طرف آ کر بیٹھ گئی۔

’’جی یہ میری بیگم ہیں زینب...... اب فرمائیے کیا بات ہے‘‘؟ اس نے کچھ پریشان ہو کر کہا‘

بیٹا تمہاری کوئی بہن ہے‘‘ اچانک سفینہ کی ماں نے پوچھا ’’یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں‘‘

داؤد نے داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اس لیے کہ اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تو تمہیں احساس ہوتا کہ کسی بھی شریف عورت پر گھٹیا الزام لگانا، اس کی کردار کشی کرنا اور آنکھیں بند کر کے اس پر تہمت لگانا اتنا غلیظ اور تکلیف دہ عمل ہے کہ اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو ماں بہن والا ہو...... تمہیں شاید قدرت نے ان نعمتوں سے محروم رکھا ہے جو تم نے میری بیٹی پر ایسے اوچھے وار کیے جو ایک انسان نہیں بلکہ بدترین دشمن ہی کر سکتا ہے‘‘

سفینہ کی ماں نے تلخ لہجے میں کہا

’’کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟ داؤد نے گھبرا کر سفینہ کی ماں کی

طرف دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا وہ اپنا چشمہ اتار کر پلو سے صاف کر رہی تھیں اور دوپٹہ ان کے سر سے سرک کر نیچے آ گیا تھا جس سے کان کی کٹی ہوئی لو صاف نظر آ رہی تھی جو پہلے دوپٹے میں چھپی ہوئی تھی ''...... آپ کا کوئی بیٹا نہیں ہے؟'' اس نے انہیں گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا

ایک لمحہ کو وہ چپ ہو گئیں پھر پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

''ہے کیوں نہیں !...... خدا اسے جیتا رکھے ...... جہاں رہے خوش رہے اور اسے دونوں جہاں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں''۔

''کہاں ہے وہ؟...... کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں رہتا''؟ اس کا نام کیا ہے؟

''آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں اور آپ کو ہمارے خاندان سے کیا دلچسپی ہے'' ...... کامران کو غصہ آ گیا۔

''پلیز آپ چپ رہیں یہ سوال بہت ضروری ہے میرے لئے بھی اور شاید ان کے لئے بھی'' داؤد نے سفینہ کی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''میں بتاتی ہوں ...... راشد نام تھا اس کا اور وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتا ...... بلکہ وہ ہمارے والد کے ساتھ رہتا ہے'' ...... سفینہ نے کہا

''آپ کے والد کا نام وحید احمد ہے'' ...... داؤد نے اچانک پوچھا

''...... ہاں ہے تو پھر؟ ...... آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں''؟ سفینہ نے تیز لہجے میں پوچھا

''اس لئے جانتا ہوں کہ میں ہی راشد ہوں وحید احمد کا بیٹا جسے وہ ماں سے جھگڑنے کے بعد زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور سب سے پہلے انہوں نے میرا نام بدلا کیونکہ پہلا نام ماں نے رکھا تھا'' داؤد نے گلوگیر لہجے میں کہا

سب اس اچانک انکشاف پر حیران تھے ''تم نے ہمیں پہچانا کیسے'' سفینہ نے دکھی لہجے میں کہا

''اماں کی آواز سن کر شک تو مجھے ہوا تھا کہ یہ آواز کہیں سنی ہے پھر جب انہوں نے چشمہ اتارا تو میں نے بخوبی پہچان لیا تھا ...... اور جب سر سے دوپٹہ ہٹا اور اماں کے کان کی کٹی لو پر میری نظر پڑی تو مجھے پھر کوئی شبہ نہ رہا۔ اماں کا کان میرے کارن ہی تو کٹا تھا ابا مجھے مار رہے تھے تب

اماں بیچ میں آ گئیں تھی اور شیشے کا گلاس جب انہوں نے اماں کو کھینچ کر مارا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اماں کو لہولہان کر گیا تھا جس کے نتیجے میں ان کے کان کی لو کٹ گئی تھی ...... پھر کیسے نہ پہچانتا جب سے جدا ہوا تھا شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اماں مجھے یاد نہ آئی ہوں وہ تو ہمیشہ ہی میرے ساتھ تھیں میں کبھی اس منظر کو نہیں بھول سکتا جب ابا مجھے زبردستی گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے اور میں روتا ہوا مڑ مڑ کر اماں کو اور تم دونوں کو دیکھ رہا تھا جو کونوں میں دبکی ہوئی بے تحاشہ رو رہی تھیں''

داؤد نے آبدیدہ ہو کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے

''تو میرا بیٹا راشد ہے ...... ماں نے کہا جواب میں داؤد اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور جذباتی ہو کر رونے لگا۔ ماں نے اس کا چہرہ اٹھایا پیشانی چومی اور کلیجے سے لگایا۔

سفینہ اس انکشاف پر حیرت زدہ تھی لیکن اس کا چہرہ کسی اندرونی دکھ کی غمازی کر رہا تھا اس نے ناگواری سے داؤد کو دیکھا اور ماں سے بولی

''کاش یہ تمہارا بیٹا اور میرا بھائی نہ ہوتا تو آج میں اس کا حساب چکتا کر دیتی ...... لیکن یہ تو میرا اپنا ہی خون ہے ...... جب بہن کے سر سے چادر کھینچ کر اسے رسوا کرنے والا اس کا اپنا ہی بھائی ہو تو شکایت کس سے ہو''؟

''مجھے معاف کر دو آپا ...... مجھے کیا معلوم تھا کہ جلن اور حسد کا شکار ہو کر میں جس کا دامن داغدار کر رہا ہوں وہ میری اپنی ہی بہن ہے ...... کاش مجھے اس کا علم ہو جاتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔

تمہاری قابلیت، علمیت اور شائستگی مجھ سے ہضم نہیں ہوتی تھی، سب لوگ جب تمہاری تعریفیں کرتے تھے تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے یہ مردذات کی توہین ہو، مردوں کی بالادستی والے معاشرے میں ایک عورت ہر لحاظ سے خود کو ان سے بہتر ثابت کر دے یہ بات میرے لئے اور چند اور لوگوں کے لئے ناقابل برداشت تھی'' ...... داؤد نے رو دینے والے لہجے میں کہا

ہونہہ!! ...... گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اگر تمہیں پتہ ہوتا کہ میں تمہاری بہن ہوں تو تم ایسا نہ کرتے'' ...... سفینہ نے طنزیہ اور تیکھے لہجے میں کہا

''بالکل سچ کہا آپا تم نے ...... '' داؤد نے تاسف آمیز لہجے میں کہا

...... گویا تمہیں دوسروں کی ان بہو بیٹیوں پر جو تمہاری کچھ نہیں لگتیں ...... کیچڑ اچھالنے کا پورا

حق حاصل ہے، اس طرح شاید تمہارے اندر کے تنگ نظر اور حاسد مرد کی ازلی جبلت کی تسکین ہوتی ہے، کیونکہ تم اور تمہارے جیسے مرد قابلیت اور صلاحیت میں عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اوچھے ہتھکنڈوں پہ اتر آتے ہو اور ان کے کردار پر کیچڑ اچھالنے لگتے ہو، سفینہ غصے سے بولی۔

''نہیں آپا...... یہ بات نہیں ہے...... تم غلط سمجھ رہی ہو'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا

''تو پھر تو نے ایسا کیوں کیا'' ماں نے دکھ سے پوچھا

''دراصل جب ابا مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے کر آ گئے تو میں تمہیں بہت یاد کرتا تھا ہر وقت روتا رہتا تھا...... تب وہ مجھے بہت مارتے اور بتاتے کہ عورت تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے بچ کر رہو، یہ بھروسے کے قابل نہیں ہے اور دنیا کی کون سے برائی ہے جو اس میں موجود نہیں،...... عورت پیر کی جوتی ہوتی ہے۔ اُسے سر پہ نہیں چڑھانا چاہیئے، ہمیشہ دبا کر رکھنا چاہیئے اور بوقت ضرورت دو چار ہاتھ جڑ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس کی کوئی بھی بات نہیں ماننی چاہیئے، وغیرہ وغیرہ، اب تم ہی سوچو ماں! کہ جب ایک دس سال کے بچے کی برین واشنگ ہر وقت یہ سب کچھ کہہ کر کی جائے گی...... اور بدقسمتی سے وہ بچہ ماں کی ممتا اور بہنوں کی شفقت سے بھی محروم ہو تو وہ کیا کرے گا؟...... وہ داؤد بن جائے گا میری طرح''

''اچھا اسی لئے آپ کا رویہ میرے ساتھ بھی ہمیشہ تحقیر آمیز ہی رہا ہے''

اچانک داؤد کی بیوی نے کہا

''ہاں شاید ایسا ہی ہے...... لیکن میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا''

''جب ایسا تھا کہ تمہارے باپ نے اپنی بدفطرت ذہنیت کی بناء پر یہ باور کرا دیا کہ عورت دنیا کی نہایت سستی، گھٹیا اور بے وقعت شے ہے تو تم نے مجھ جیسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کیوں کی...... اگر کرنی ہی تھی تو کسی جاہل ان پڑھ سے کرتے...... میری زندگی کیوں برباد کی'' وہ ناگواری سے بولی

''اگر ابا زندہ ہوتے تو واقعی یا تو میری شادی نہ کرواتے یا پھر کوئی گنوار یا دیہاتن بیاہ لاتے ...... لیکن حمیدہ تم بس مجھے اچھی لگتی تھیں اور جب کوئی اچھا لگتا ہے تو پھر بقیہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے''۔ داؤد نے گہرے لہجے میں کہا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ماں کے سامنے معافی مانگنے

والے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''اماں مجھے معاف کر دو اور آپا سے کہو وہ بھی مجھے معاف کر دیں...... جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا''۔

''ایک بات بتاؤ داؤد کہ اگر میں تمہاری بہن نہ ہوتی تو کیا تب بھی تم اپنی نازیبا گھٹیا اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت کی اسی طرح معافی مانگتے اور اتنے ہی شرمندہ ہوتے جتنے اس وقت نظر آ رہے ہو...... سفینہ نے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

''شاید نہیں ...... بلکہ قطعی نہیں...... بلکہ میں کل دفتر جا کر کچھ اور غلط باتیں پھیلاتا'' داؤد نے روتے ہوئے سچائی سے کہا

''بس میں یہی سننا چاہتی تھی...... گویا دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کے لئے تم مذہب کو آڑ بنا کر جس طرح چاہو بدنام کرو...... کوئی تم سے پوچھنے اور چیک کرنے والا نہیں ہے دراصل تم جیسے مرد مردوں کے نام پر دھبہ ہو تم وہ لوگ ہو جو کسی میدان میں کسی عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس کا اعتراف کرنے کے بجائے اس سے حسد کرنے لگتے ہو، اسے بدنام کرتے ہو کیونکہ تم لوگ صرف ایسا ہی کر سکتے ہو''

وہ کامران کے ساتھ دروازے سے باہر جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

''کہاں جا رہی ہو آپا...... بس کرو بہت ہو گیا ہے میں نے تم سے معافی تو مانگ لی ہے'' داؤد نے کہا

''تم نے معافی ضرور مانگی ہے، لیکن میں نے تمہیں معاف نہیں کیا ہے اور نہ کبھی کروں گی بلکہ بہت جلد اپنا ٹرانسفر کسی دوسری برانچ میں کروالوں گی میں تو تمہیں بھائی ماننے سے بھی انکار کرتی ہوں، کیونکہ جو شخص کسی پاکباز عورت کے کردار پر تہمت لگائے وہ ہرگز میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔

✠✠✠✠✠✠✠

''پل صراط''

''رپورٹ کب ملے گی آپ کی''؟ تہمینہ نے اپنے ہاتھ میری پیشانی پہ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''دو تین دن میں'' میں نے مختصراً کہا اور کروٹ بدل لی۔

تہمینہ سمجھ گئی کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے اسی لئے میں آج جلدی گھر آ گیا تھا، وہ دروازہ بھیڑ کر باہر چلی گئی، اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں بھر آئیں، میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی ڈاکٹر بابر کے الفاظ ہتھوڑے کی طرح میرے سر پر برس رہے تھے۔

''امجد تمہارے اندر اولاد پیدا کرنے والے جرثومے نہ ہونے کے برابر ہیں'' اس نے شائستہ اور محتاط لہجے میں حقیقت واضح کر دی کیونکہ وہ میرا دوست تھا، اگر کوئی اجنبی ڈاکٹر ہوتا تو سیدھا سیدھا کہہ دیتا کہ ''مسٹر آپ باپ بننے کے اہل نہیں ہیں''۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے سر بازار کسی نے رسوا کر دیا ہو مرد کے لئے یہ کتنی بڑی اور نازک بات ہے اس کا ادراک مجھے اس وقت ہوا جب یہ قیامت مجھ پر ٹوٹی اور تہمینہ گذشتہ ڈیڑھ سال سے کس کرب سے گذر رہی تھی مجھے اس کا قطعی احساس نہ تھا کہ وہ کس طرح ہر دوسری عورت کے اس سوال کا جواب دیتی ہوگی۔

''ابھی تک گود ہری نہیں ہوئی؟ خیر سے ڈیڑھ سال شادی کو ہو گیا''۔

خود میری ماں کئی بار اسے اس کمی کا احساس دلا چکی تھیں کہ وہ اب تک ماں نہیں بن سکی ہے، اور یہ کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، تین بہنوں کا اکیلا بھائی، میری ماں اور بہنیں خود تہمینہ کو مختلف لیڈی ڈاکٹروں کے پاس لے کر جاتیں اور واپس آ کر بتاتیں کہ ''خرابی کوئی نہیں، بس اللہ کی مرضی ابھی نہیں ہے''۔

تب ایک دن تہمینہ نے مجھ سے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ڈاکٹر خوشنودہ کہہ رہی تھیں کہ میاں بیوی دونوں کو چیک اپ کرانا چاہیئے''

پھر میری بڑی بہن نے بھی یہی مشورہ دیا کہ میں بھی اپنا چیک اپ کروالوں کافی دن گذر

گئے اور یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی کاروباری مصروفیات کی بناء پر مجھے وقت نہیں مل پا رہا تھا کہ ایک دن میری ملاقات ڈاکٹر بابر مرتضٰی سے ہوگئی جو کالج میں میرا کلاس فیلو تھا، اس کی شادی مجھ سے چند ماہ پہلے ہی ہوئی اور وہ ایک پیاری سی بیٹی کا باپ تھا اور جلد ہی دوسرے بچے کا باپ بننے والا تھا، اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ پہلی فرصت میں چیک اپ کرواؤں، اس مقصد سے وہ مجھے خود اپنے اسپتال لے گیا اور رپورٹ آئی تو میں جیتے جی مر چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں ایک امیر کبیر گھرانے کا فرد تھا، والد کی اپنی ٹیکسٹائل مل تھی، میں دیکھنے میں معمولی شکل وصورت کا حامل تھا، قد بھی چھوٹا اور رنگ گہرا سانولا، گنج مجھے اپنے دادا سے ورثے میں ملا تھا لیکن ہر مرد کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ میری بیوی بھی انگریزی بولنے والی گوری چٹی اور خوبصورت اور دبلی پتلی اسمارٹ لڑکی ہو میں اس مطالبے میں حق بجانب تھا کیونکہ میں دولت مند تھا، دولت مندوں کے لئے انگریزی فرفر بولنے والی اسمارٹ بیویاں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ قرعہ فال متوسط طبقے کی تہمینہ کے نام اچانک ہی نکل آیا۔ جبکہ میرے گھر والے خصوصاً بہنیں اپنی ٹکر کا کوئی مالدار اور صاحب حیثیت گھرانہ ڈھونڈ رہی تھیں، ایک دن میں اپنی چھوٹی بہن سمیرہ کو لینے اسکے کالج گیا تو گیٹ سے نکل کر تہمینہ کالج کی وین میں بیٹھ گئی، میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا وہ واقعی خوبصورتی کا مکمل نمونہ تھی، گھر آیا تو بس وہی نظروں کے سامنے بار بار آ جاتی تھی آخر میں نے مجبور ہو کر سمیرہ سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ پہچان نہ پائی، اگلے دن میں پروگرام کے مطابق پھر کالج کے گیٹ پر موجود تھا لیکن اس بار سمیرہ پہلے ہی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی، اور پھر جیسے ہی وہ نظر آئی میں نے سمیرہ کو اشارہ کیا۔

''اچھا یہ...... یہ تہمینہ ہے فائن آرٹس کی طالبہ ہے اور پینٹنگ بہت اچھی کرتی ہے''

''اور کچھ؟ کہاں رہتی ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تہمینہ بیوہ ماں کی بیٹی تھی ایک بھائی تھا جو کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھا، مکان اپنا تھا جس کی

اوپر کی منزل کرائے پر تھی جس سے تہمینہ کے تعلیمی اخراجات پورے ہو رہے تھے، ماں کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں، میرا رشتہ انہیں اپنی بیٹی کے لئے نعمت غیر مترقبہ لگا، نہ جہیز کی ڈیمانڈ نہ کوئی اور شرط بلکہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونے والے شادی کے اخراجات بھی میں نے اپنے ذمے لے لئے اور شادی سے پہلے ہی اس کے بھائی سجاد کو اپنی ٹیکسٹائل مل میں اکاؤنٹ آفیسر مقرر کر دیا، ابا جان کو بھی اس فیصلے سے خوشی ہوئی اور پھر ایک دن تہمینہ دلہن بن کر آئی اور میرے گھر کی رونق دوبالا ہو گئی جو دیکھتا تھا وہ میری خوش نصیبی پہ رشک کرتا تھا جبکہ تہمینہ کے رشتہ دار اس کی خوش قسمتی پہ پھولے نہ سماتے تھے، تہمینہ ایک آرٹسٹک مزاج کی لڑکی تھی وہ کلاسیکل میوزک سنتی تھی، افسانے اور ناول شوق سے پڑھتی تھی، تصویریں بناتی تھی، اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے میری ماں نے ایک الگ کمرہ اس کے لئے مخصوص کر دیا جسے اس نے اپنا اسٹوڈیو بنا لیا تھا اور پھر میں نے اس کی تصویروں کی نمائش بھی ایک بڑی آرٹ گیلری میں کروادی تھی، وہ بہت خوش رہتی تھی لیکن کبھی کبھار جب وہ کوئی غزل یا موسیقی کا پروگرام سن رہی ہوتی تو مجھے بھی اس میں شریک کرنا چاہتی، اسی طرح اپنی کوئی بھی پینٹنگ مکمل کرتے وقت وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے رنگوں اور اسٹروک کو سمجھوں اور رائے دوں لیکن میں ایک بزنس مین اور سائنس کا اسٹوڈنٹ، مجھے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے تو اس کی تصویروں کی نمائش بھی اس لئے کروادی تھی کہ میں کبھی کبھی جسمانی اور ظاہری طور پر خود کو اس سے کمتر محسوس کرتا تھا جبکہ وہ مجھ سے تقریباً پندرہ برس چھوٹی تھی، لیکن بعض اوقات بات کرتے ہوئے وہ مجھے بچہ سمجھتی تھی۔ وہ جس تقریب میں بھی جاتی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی بڑے بڑے بزنس ٹائی کون اس سے بات کرنے کے خواہاں رہتے اور میں فراخدلی سے انہیں یہ موقع دے کر خود کو "کلچرڈ" ظاہر کرتا تھا، تہمینہ کو میں اور میری بہنوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ غیر ضروری شرم وحیا اور حجاب "طبقہ اشرافیہ" میں معیوب سمجھا جاتا ہے سو وہ یہ بات بہت جلد سمجھ گئی۔

وقت کے ساتھ مجھے بھی اولاد کی خواہش ستانے لگی تھی، لیکن آج جب یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ قصوروار میں خود ہوں تو تہمینہ پر اور بھی پیار آیا، میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک فیصلہ

کیا،اگلے دن میں ڈاکٹر بابر کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ رپورٹ بدل دے، اس طرح ایک تو میں شرمندگی سے بچ سکتا تھا دوسرے میرے والدین بھی صدمے سے نڈھال ہونے سے بچ جاتے، دوسری رپورٹ جو ٹھیک ٹھاک فیس دے کر مجھے ملی وہ لے جا کر میں نے تہمینہ کو دیدی۔

''سب ٹھیک ہے تم خود پڑھ لو..........بس اللہ کے ہاں دیر ہے'' میں نے کہا

''سب ٹھیک ہے'' سن کر اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی، اس نے امی اور ابو کو بھی رپورٹ لے جا کر دکھائی اور اپنے اسٹوڈیو میں جا کر کوئی تصویر مکمل کرنے لگی، امی اپنے کمرے سے اٹھ کر آئیں اور افسردہ لہجے میں بولی

''جو خدا کی مرضی...... میں اب کوئی مزار نہیں چھوڑوں گی تیری اولاد کی منت ماننے کے لئے، چل مجھے پہلے لاہور لے چل حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر، وہاں سے بری امام جائیں گے اور پھر ملتان، اور عید کے بعد دوبئی کے راستے میں اجمیر شریف جاؤں گی، امروہے جاؤں گی، دلی جاؤں گی اور تیرے لئے اولاد کی بھیک مانگوں گی''۔

''اماں ایسا نہ کریں کہ کوئی یتیم اور لاوارث بچہ گود لے لیں'' میں نے آہستہ سے کہا

''نہیں نہیں'' وہ اچانک بولیں ''اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے......اور پھر ابھی تم لوگوں کی عمر ہی کیا ہے...... ہاں تم ایسا کرو کہ اپنی غذا میں بند گوبھی کا بھی اضافہ کر دو...... میں خود تمہارے لئے روز کوئی نہ کوئی ڈش بند گوبھی کی بنا دوں گی اور سلاد میں بھی تم اسے کھاؤ''۔

پھر میں نے تہمینہ سے بچہ گود لینے کی بات کی تو وہ بدک گئی کہنے لگی ''ایسا تب کیا جاتا ہے جب ڈاکٹر میاں بیوی دونوں کو نا امید کر دیں...... جب مجھ میں اور تم میں کوئی خرابی نہیں ہے تو پھر سال دو سال اور انتظار کیا جا سکتا ہے''

میری طبیعت کی اداسی کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی کبھی دل کہتا تہمینہ کو سب کچھ سچ بتا دوں اور پھر اسے اختیار دیدوں کہ چاہے تو میرے ساتھ رہے ورنہ طلاق لے لے، ایک دن اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا کمپیوٹر پہ چیٹنگ کر رہا تھا کہ میرا خالہ زاد بھائی شہریار مرزا

آن لائن آ گیا، ہم میں بہت دیر باتیں ہوتی رہیں وہ ایک آرٹسٹ تھا کراچی میں بھی مختلف آرٹ گیلریز میں اس کی تصویروں کی نمائش ہو چکی تھی، پانچ سال پہلے وہ اپنے بہن بہنوئی کی دعوت پر لندن چلا گیا جو وہاں طویل عرصے سے بلیک برن کے علاقے میں رہتے تھے، ان کا اپنا ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار تھا جو بہت شاندار طریقے سے چل رہا تھا، شہریار اپنے بہنوئی کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ ایک آرٹ اسکول میں تصویریں بنانا بھی سکھاتا تھا، ساتھ ساتھ گھر کو بھی اسٹوڈیو بنایا ہوا تھا جہاں بیشتر طالب علم اس سے مصوری کے اسرار و رموز سیکھنے آتے تھے، یہ لوگ کافی متمول تھے اور ان کا اپنا ذاتی گھر تھا، شہریار نے اب تک شادی نہیں کی تھی کیونکہ عام فنکاروں کی طرح اس میں بھی ایک لا ابالی پن تھا، البتہ گرل فرینڈز کے معاملے میں وہ خاصا خوش نصیب واقع ہوا تھا، وہ اکثر و بیشتر مجھے بھی یہ مشورہ دیتا کہ شادی کا طوق گلے میں نہ ڈالوں لیکن اس معاملے میں میری رائے اس سے بالکل مختلف تھی، گھریلو زندگی کا اپنا ایک سکھ ہوتا ہے جس کا اندازہ شادی کے بعد ہوتا ہے۔ شہریار نے مجھے تہمینہ کے ساتھ لندن آنے کی دعوت دی جو مجھے اس وقت ایک نعمت لگی، میں نے فوراً ہی اس سے وعدہ کرلیا، تہمینہ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئی لندن جانا بھی اس کے ایک خواب کی تعبیر تھی، میں بھی ماحول سے فرار چاہتا تھا، اس لئے بھی یہ موقع مجھے غنیمت لگا اور پھر دوسرے ہی ہفتے ہم لندن کے لئے روانہ ہو گئے، میرا خیال تھا کہ ایک بار وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھادوں اگر وہ بھی مایوسی کا اظہار کرے تو تہمینہ کو سب کچھ سچ سچ بتادوں اور حقیقت جاننے کے بعد اگر وہ مجھ سے الگ ہونا چاہے تو برضا و رغبت اُسے طلاق دیدوں! کیونکہ جب وہ بانجھ ہی نہیں تھی تو پھر ماں بننے سے کیوں محروم رہے۔

شہریار ایئرپورٹ پر ہی تہمینہ کو دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا بغیر کسی کی پرواہ کئے مجھ سے بولا۔

''یہ چغتائی آرٹ کا جیتا جاگتا شاہکار تمہیں کہاں سے مل گیا''؟

میرا سینہ فخر سے پھول گیا، تہمینہ بھی شرما گئی، شاید اُسے اس بھرپور اور آرٹسٹک انداز میں کسی نے پہلی بار سراہا تھا، جبکہ میں یہ جانتا بھی تھا اور دیکھتا بھی تھا کہ اس کی جانب اٹھنے والی ہر نگاہ میں ستائش ہوتی تھی خوبصورت بیویوں کے شوہروں کو جو ایک ملکیت کا احساس ہوتا ہے وہ مجھے بھی

رہتا تھا خاص کر اس وقت جب وہ میرے ہمراہ ہوتی تھی، شہریار یہاں آ کر بہت اسمارٹ اور سرخ وسفید ہو گیا تھا اور اپنی عمر سے کہیں چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

لندن آ کر تہمینہ بہت خوش تھی شہریار کی بڑی بہن طاہرہ باجی اور ان کے شوہر اور بچے سب ہی تہمینہ سے اور مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے طاہرہ باجی کے دو بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی صرف ایک بیٹی عمارہ کنواری تھی اوپر کی منزل پوری کی پوری شہریار کے استعمال میں تھی، تہمینہ کو سب سے زیادہ خوبصورت یہاں کا موسم لگا دوسری بڑی دلچسپی اسے شہریار کی پینٹنگ سے تھی وہ اکثر و بیشتر اس سے مصوری کے اسرار ورموز سیکھتی، ایک دن شہریار نے ڈنر کرتے ہوئے اچانک مجھ سے کہا۔

''یار اف یو ڈونٹ مائنڈ، اگر تو اجازت دے تو میں تیری بیوی کا ایک پورٹریٹ بنالوں، تا کہ اگلے ماہ ہونے والی ایگزی بشن میں رکھ سکوں''؟

''اس میں برا ماننے والی کونسی بات ہے اور پھر میری اجازت سے زیادہ تہمینہ کی اجازت کی ضرورت ہے اس سے پوچھ لو'' میں نے خوشدلی سے کہا

''وہ تو راضی ہے'' شہریار نے ہنس کر کہا

''پتہ ہے امجد انکل یہ آئیڈیا میں نے ماموں کو دیا ہے کہ اس بار نمائش کے لئے تہمینہ بھابی کو ماڈل بنائیں''......عمارہ نے خوش ہو کر بتایا۔

اگلے ہی دن شہریار نے کام شروع کر دیا، اس نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک کشن پر تہمینہ کو راجستھانی عورت کا لباس پہنا کر بٹھایا جو اس نے کسی انڈین فیملی سے حاصل کیا تھا، ساتھ ہی تمام تر چاندی کے راجستھانی زیورات بھی تھے، تہمینہ اس لباس اور زیورات میں کوئی اپسرا لگ رہی تھی جو کسی کے انتظار میں اداس بیٹھی ہو، اسی دوران میں نے خاموشی سے اکیلے جا کر وہاں کے مشہور ڈاکٹر جانسن سے اپائنٹمنٹ لیا اور اپنا مسئلہ بتایا، انہوں نے چند ضروری ٹیسٹ کروانے اور ایک ہفتے کے بعد رپورٹ دینے کے لئے کہا اسی دوران کراچی سے ابو کا فون آ گیا اور چند دنوں کے لئے ٹیکسٹائل کے کسی کام سے مانچسٹر جانے کا حکم ملا، جب تہمینہ سے میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے تصویر مکمل کروائے بغیر جانے سے صاف انکار کر دیا، خود شہریار کا کہنا بھی یہ تھا کہ کوئی بھی ماڈل

مختلف اوقات میں یکساں موڈ اور یکساں پوز برقرار نہیں رکھ سکتا، چنانچہ طے یہ پایا کہ بزنس ٹرپ پر میں اکیلے ہی جاؤں اس عرصہ میں تہمینہ کی تصویر بھی مکمل ہو جائے گی پھر اگلے ہفتے ہم واپس چلے جائیں گے۔

جب میں مانچسٹر سے واپس آیا تو ابھی تک اس کا پورٹریٹ مکمل نہیں ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ تہمینہ یہاں آ کر بہت خوش ہے، مانچسٹر میں مجھے تین چار دن کے بجائے ایک ہفتہ لگ گیا تھا، واپس آ کر جب میں ڈاکٹر جانسن سے ملا تو رپورٹ دیتے وقت اس نے افسردہ لہجے میں کہا ''سوری'' اور اس ایک لفظ نے وہ سب کچھ بتا دیا جو رپورٹ میں لکھا ہو گا۔

............رپورٹ لے کر میں تھکا تھکا سا گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ عمارہ کا رشتہ اس کے کزن سے طے ہو گیا ہے جو برمنگھم میں رہتا ہے شادی اگلے ماہ طے ہوئی تھی، طاہرہ باجی، نظام بھائی اور شہریار نے اصرار کر کے ہم لوگوں کو روک لیا، خاص کر عمارہ تہمینہ سے بہت مانوس ہو گئی تھی، دونوں میں گہری دوستی تھی اور وہ ہر قیمت پر تہمینہ کو شادی کے موقع پر اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھی بہر حال سب لوگوں کے بے حد اصرار پر میں نے امی اور ابو کو کراچی فون کر کے بتا دیا کہ ہم لوگ ابھی عمارہ کی شادی تک یہیں رکیں گے پردیس میں رہنے والوں کے لیے ان کے وطن سے آئے ہوئے عزیز رشتہ دار ایک سرمایہ ہوتے ہیں، اسی دوران طاہرہ باجی کا اپنی نند کے پاس برمنگھم جانا ضروری ہو گیا، نظام بھائی کا ساتھ جانا ممکن نہ تھا شہریار تہمینہ کی تصویر مکمل کرنے اور اسے شاہکار بنانے میں پوری طرح منہمک تھا چنانچہ قرعہ فال میرے نام پڑا وہ مجھے لے کر برمنگھم آ گئیں شادی کی تفصیلات طے کرنے، واپس آئے تو شہریار نے اپنا کام ختم کر لیا تھا، میں نے جب پورٹریٹ دیکھا تو دنگ رہ گیا، شہریار نے نہایت خوبصورتی اور مہارت سے اس کی جسمانی خوبصورتی اور نشیب و فراز کو واضح کیا تھا، تصویر دیکھ کر میں نے بے اختیار تہمینہ کو چوم لیا، لیکن اندر اندر آنسوؤں کے سمندر نے میرے پورے وجود کو بھگو دیا۔

کراچی واپس پہنچنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح تہمینہ سے بات کروں، اس خیال ہی سے وحشت ہونے لگتی تھی کہ تہمینہ مجھ سے جدا ہو جائے گی میں اس کے بغیر

کیونکر رہوں گا، ہم تقریباً ایک ماہ سے زیادہ لندن میں رہ کر آئے تھے وہاں کی آب وہوا نے تہمینہ پر بہت خوشگوار اثر ڈالا تھا وہ گھر والوں کو وہاں کی تفصیلات بتا بتا کر خوش ہوتی تھی، خاص کر شہر یار سے وہ بہت متاثر تھی، اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک Born Artist ہے اس نے تہمینہ کو مصوری کے بارے میں بعض بڑی ضروری اور نازک معلومات فراہم کی تھیں اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جب تہمینہ دس بارہ تصاویر بنالے تو وہ کراچی آئے گا اور پھر شاندار طریقے سے اس کی تصاویر کی نمائش کا بندوبست کرے گا، ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگی کہ کیوں نہ ہم مستقل طور پر لندن میں رہیں اس طرح لوگوں کے ان سوالات سے بچ سکیں گے جو وہ ہم دونوں سے اولاد نہ ہونے کے سلسلے میں کرتے ہیں، بات تو اس کی معقول تھی لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ وہ اس کی ذمہ دار نہیں ہے۔

نہ جانے میں نے کتنی مرتبہ چاہا کہ اسے سب کچھ بتادوں، لیکن ہر بار میری ہمت جواب دے جاتی، اسے کھونے کا خیال ہی سوہان روح تھا، پتہ نہیں کیوں مجھے یہ یقین تھا کہ اصلیت جان لینے کے بعد وہ میرے ساتھ نہیں رہے گی، میں اسے دل وجان سے چاہتا تھا اتنا کہ شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت کو چاہا ہو، عام طور پر شادی کے کچھ عرصہ بعد انسانی جذبات میں کمی آجاتی ہے ٹھہراؤ آجاتا ہے لیکن میرے جذبات تہمینہ کے لئے اب بھی وہی تھے جو پہلے دن تھے اب میں کروں تو کیا کروں؟ یہی سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھا جارہا تھا کہ ایک دن اپنے اسٹوڈیو میں تصویر بناتے ہوئے تہمینہ چکرا کر گر پڑی۔

اس کی آواز پر میں نے جا کر دیکھا تو وہ فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ تمام رنگ فرش پہ بکھر گئے تھے، امی نے اسے اٹھایا تو اس نے کمزوری کی شکایت کی اور یہ بھی کہ اسے اچانک شدید چکر آگئے تھے، ہم لوگ اسے قریبی لیڈی ڈاکٹر کے کلینک لے گئے ڈاکٹر صاحبہ نے مریضوں سے فرصت پا کر تفصیل اور توجہ سے بات سنی پھر چیک اپ کے لئے دوسرے کمرے میں لے گئیں...... تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو مسکرا کر امی سے بولیں۔

"کوئی خطرے کی بات نہیں ہے بلکہ خوشی کی بات ہے کہ آپ دادی بننے والی ہیں"

دادی بننے والی ہیں"

امی کا چہرہ یکدم خوشی سے جگمگانے لگا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے کسی بچھو نے ڈنک ماردیا ہو میں فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ڈاکٹر سے پوچھا ''ڈاکٹر آر یو شیور، کہ ایسا ہے۔

''جی ہاں مسٹر امجد مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی مسز امید سے ہیں اور جلد ہی آپ کو پاپا کہنے والا دنیا میں آنے والا ہے مبارک ہو آپ کو مٹھائی کھلایئے''

امی نے فوراً پرس سے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیئے، اس تمام عرصہ میں تہمینہ خاموش سی رہی۔

گھر آ کر جب امی نے یہ خوش خبری ابو کو سنائی تو وہ مسکرا کر بولے

''دیکھو سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے، اس کا یقین آج مجھے آ گیا''

یکدم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا واقعی لندن کا سفر میرے لئے خوشیاں لایا تھا، شہریار نے نہ صرف تہمینہ کا پورٹریٹ مکمل کیا تھا بلکہ میری ادھوری اور نامکمل تصویر میں بھی رنگ بھر کے اسے مکمل کر دیا تھا۔ اب تہمینہ کو مجھ سے کوئی الگ نہیں کر سکتا تھا۔

✠✠✠✠✠✠✠
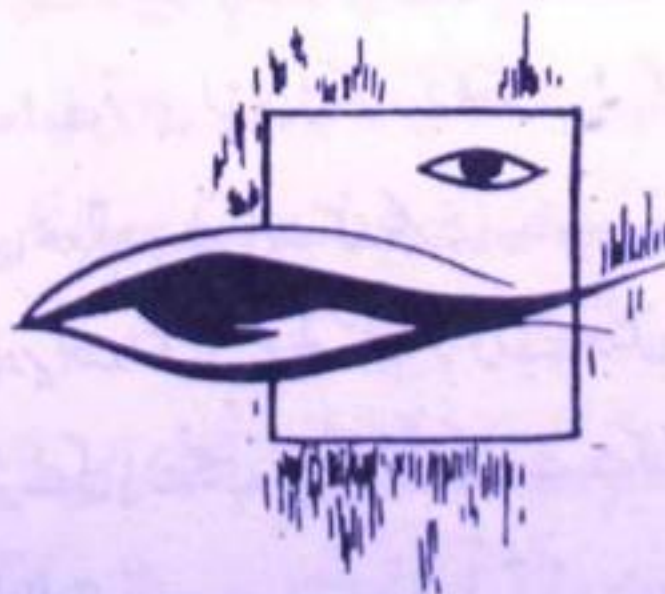
''خواب' سراب'

توبہ کیا آفت مچا رکھی ہے کم بخت دوپہر کو بھی ایک منٹ کے لیے چین نہیں لینے دیتے۔''

''مجال ہے جو آنکھ لگنے دیں۔'' زبیدہ بیگم نے عاجز آ کر کہا۔

''آؤ آؤ آنکھ مچولی کھیلیں۔'' شکیلہ نے عابد سے کہا۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے آؤ بھئی سلیم' اجالا آؤ آنکھ مچولی کھیلیں مگر چور کون بنے گا۔'' عابد نے شکیلہ سے پوچھا۔

''چور.... ارے چور تو اجالا بنے گی۔'' شکیلہ نے کہا۔

''کیوں....؟'' میں کیوں بنوں گی؟'' اجالا نے پوچھا۔

''نہیں.... میں چور ہرگز نہیں بنوں گی۔''

''اگر نہیں بنوگی تو ہم تمہیں کھلائیں گے بھی نہیں.... جاؤ بھاگ جاؤ'' عابد بولا۔

اُجالا مُنہ بسورتی ہوئی کمرے میں آ گئی اور حسرت سے اپنے بہن بھائیوں کو دیکھنے لگی۔

زبیدہ بیگم اور حمید صاحب کے چار بچے تھے، شکیلہ، عابد سلیم اور اجالا۔ کچھ خدا کی قدرت تھی کہ سوائے اجالا کے تینوں بچے نہایت خوبصورت تھے۔ گورا رنگ دھلے دھلے جیسے سفید سفید مرغی کے چوزے، بالکل زبیدہ بیگم پر گئے تھے۔

اجالا کا ناک نقشہ اتنا برا تو نہ تھا مگر رنگ کے آگے وہ بھی مات تھا۔ خود حمید صاحب بھی گوری رنگت کے مالک تھے۔ نجانے یہ کالا رنگ اجالا کو کہاں سے مل گیا تھا جبکہ نھیال ددھیال سب میں

پھوپھی خالائیں، ماموں اور چچا تایا کوئی بھی تو کالا نہ تھا۔ دادی اماں کہتی تھیں کہ جب اجالا کی ماں امید سے تھی تو ایک کالی سیاہ بنگالن گھر میں کام کرتی تھی چونکہ وہ ہر وقت زبیدہ بیگم کے سامنے رہتی تھی اس لیے اجالا ایسی پیدا ہوئی۔ اپنے کالے رنگ کی وجہ سے اجالا ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کی کم سے کم توجہ کا مرکز تھی اور اس کے اپنے بہن بھائی بھی اپنے سامنے اسے حقیر سمجھتے تھے۔ نازک نازک سے ہاتھ پیروں والی شکیلہ ماں اور باپ دونوں ہی کا عکس تھی دونوں یہ دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے کہ شکیلہ کے پیکر میں ان کی خوبصورتی جلوہ گر تھی۔ شکیلہ جوان کی پہلی اولاد تھی اور ان کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت، خود دونوں میاں بیوی چاند سورج کی جوڑی تھے۔ رہے عابد اور سلیم تو وہ شکیلہ کے ہم پلہ تھے۔ اجالا اس ماحول میں خود کو مرغی کے اس کمزور بچے کی طرح محسوس کرتی تھی جو چیل کو دیکھ کر ماں کے سائے میں محفوظ ہونے سے رہ گیا ہو، جب دادی اماں شکیلہ کو پیار کرتیں تو اس کا ننھا سا دل پھڑ پھڑا کر رہ جاتا۔ اس کا جی چاہتا وہ بھی شکیلہ کی طرح ضد کرے اور اپنی بات منوائے لیکن اس کی یہ حسرت ہمیشہ دل ہی میں رہ جاتی۔ ابا سے فرمائش کر کے چیزیں منگوانا محض اس کا ایک خواب تھا۔ اس کے لیے تو امی نے بھی کبھی نئے کپڑوں کی ضرورت محسوس نہ کی جو کپڑے شکیلہ کے چھوٹے ہو جاتے وہ اجالا کے کام آتے۔ بس عید بقر عید پر اسے نئے کپڑے پہننے کو ملتے گویا وہ ایک عضو معطل تھی جس کو زبردستی اور نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار اس نے زرین صاحب کی لڑکی نجمہ کو سرخ چمچماتی فراک میں دیکھا، نجمہ کا رنگ بھی خاصا گہرا تھا اور وہ موٹی بھی بہت تھی تو وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ماں کی گردن میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولی۔

''امی امی.... مجھے بھی نجمہ جیسی لال رنگ کی فراک بنا دیجیے۔''

''اچھا!!'' زبیدہ بیگم نے ناک سکیڑ کر کہا....

''تمہارے باوا کہیں ڈپٹی کلکٹر لگے ہیں جو نجمہ جیسا قیمتی فراک بنا دوں۔ وہ تو اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہے اس لیے یہ اللے تللے ہوتے ہیں۔ ہماری اتنی گنجائش کہاں۔''

وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور ایک کونے میں جا کر دبک گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں زبیدہ بیگم

نے شکیلہ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''شکیلہ وہ الماری میں سے ہری مخمل نکال لاؤ میں تمہاری قمیض سی دوں سردیاں آنے والی ہیں۔''

اجالا نے حیرت سے ماں کو دیکھا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہے۔؟

''امی باجی جیسی قمیض میری بھی سی دیجیے!اس نے ہمت کر کے کہا

''پہلے باجی جیسی شکل تو لاؤ جو کپڑا سجے' پھر سی دوں گی۔لو بھلا شکل چڑیلوں کی مزاج پریوں کے۔''

زبیدہ بیگم روانی میں بولتی چلی گئیں اور ایک لمحے کو بھی نہ سوچا کہ کہ ان کے تیز وتند جملوں نے خود ان کی اپنی بیٹی کا ننھا سا دل چکنا چور کر دیا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے واپس پلٹ گئی۔اس کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔آخر نجمہ بھی تو کالی ہے مگر اس کی امی کیوں اسے اتنا پیار کرتی ہیں؟ کیوں روز روز اس کے لیے رنگ برنگے کپڑے بناتی ہیں۔وہ ماں کے ساتھ جہاں بھی جاتی کوئی اسے زبیدہ بیگم کی اولاد ماننے کو تیار نہ ہوتا کوئی بھی اسے شکیلہ، عابد اور سلیم کی بہن نہ سمجھتا۔بعض اوقات تو خود زبیدہ بیگم یہ سمجھ بیٹھتیں کہ یہ ان کی اولاد نہیں ہے۔آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ کالی ہے اس لیے کوئی اسے پسند نہیں کرتا اور اسی لیے وہ اچھے اچھے کپڑوں کی یا کسی کے پیار کی مستحق نہیں ہے گویا کالا ہونا اتنا بڑا جرم تھا جس کا کوئی تدارک نہ تھا۔رفتہ رفتہ وہ تنہائی پسند ہوتی گئی۔اس نے صاف ستھرا رہنا بھی چھوڑ دیا وہ ہر ایک سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی جیسے اسے کوئی چھوت کی بیماری ہو کہ جس کے پاس بھی بیٹھے گی اسے لگ جائے گی اس کی طبیعت میں چڑ چڑا پن آگیا۔شام کو جب تمام بہن بھائی تیار ہو کر باہر نکلتے تو وہ کمرے میں پڑی رہتی زبیدہ بیگم اگر تیار ہونے کو کہتیں تو وہ بالوں کو اور زیادہ بکھیر لیتی وہ ماں کی آواز سنتی اور خاموش رہتی اسے لگتا کہ اس کا جواب نہ پا کر امی ابھی آئیں گی اور اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پیار کریں گی جن میں چھپنے کی اسے بڑی تمنا تھی مگر اس کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوتی۔جب متعدد آوازیں دینے کے بعد بھی وہ نہ آتی تو تھپڑوں اور صلواتوں سے اس کی تواضع کی جاتی اور اس کی یہ آرزو دل ہی میں رہ جاتی کہ امی اسے آ کر اپنے سینے سے لگالیں اور وہ یوں بے بس ہو جاتی جیسے چڑیا کا

ننھا سا بچہ انسانی ہاتھ لگنے سے ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا ہو اور پھر دادی اماں کی آواز سنائی دیتی جنہیں ایک کونے میں بیٹھے بیٹھے صلواتیں سنانے اور تنقید کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ تھا ان صلواتوں میں سب سے زیادہ حصہ اجالا کا ہوتا تھا۔ ذرا بھی موقع ملا اور شروع ہو گئیں جیسے اجالا ان کے بیٹے کی اولاد نہ ہو۔

''اے خدا کی سنوار۔ اس لڑکی پر نہ جانے کس چڑیل کا سایہ پڑا ہے۔ ایک تو شکل بھتنیوں جیسی پھر اس پہ سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ صفائی تو اسے چھو کر نہیں گئی۔'' پھر وہ زبیدہ بیگم سے مخاطب ہو جاتیں۔

''اے دلہن مجھے تو لگتا ہے یہ اسپتال میں بدل گئی۔ ورنہ خاندان میں کسی سے تو ملتی!! بالکل الگ تھلگ شکل، عادتیں دیکھو تو بھنگنوں جیسی۔ کہیں کسی بھنگن نے اسے اسپتال میں بدل تو نہیں دیا۔''

کبھی کبھی تو خود زبیدہ بیگم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتیں اور اجالا کو یوں لگتا جیسے وہ واقعی اسپتال میں بدل گئی ہو جبھی تو اسے کوئی پیار نہیں کرتا۔ بہن بھائی ہر وقت مذاق اڑاتے اور ماں باپ ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنی حقیقی ماں کو پکارنے لگتی جو اسی کی طرح کالی تھی اور اسپتال میں رہ گئی تھی۔ کبھی کبھار وہ بے اختیار ہو کر گھر سے باہر آ جاتی تو دوسرے ہی لمحے اسے بھائی بہنوں کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔

''کالی کلوٹی بینگن لوٹی... کالی کلوٹی بینگن لوٹی۔ بھری دوپہر میں دھم دھم کودی..... کالی کلوٹی... کالی کلوٹی۔''

اسے بھاگتے ہی بن پڑتی اور یہ آوازیں تیر کی طرح سنسناتی ہوئی اس کا پیچھا کرتیں کالی... کالی.... وہ گھر میں آ کر منہ چھپا کر لیٹ جاتی اور پھر جنون بڑھتا تو غسل خانے میں جا کر صابن سے رگڑ رگڑ کر منہ دھوتی اور پھر آئینہ دیکھتی مگر ازل نے جو سیاہی اس کے منہ پر مل دی تھی وہ بھلا صابن سے کیسے چھوٹتی۔ آنے جانے والے مہمان بھی اکثر و بیشتر اس کے ننھے سے دل کو انجانے میں چھلنی کرتے رہتے۔ ایک دن رباب خالہ کے ساتھ ان کی ساس آئیں تو اجالا کو دیکھ کر بولیں۔

''زبیدہ تم نے اس کا نام اجالا کیوں رکھا۔ اس کا نام تو اندھیرا ہونا چاہیے تھا'' اور جواب میں سب

ہنس دیئے کسی نے یہ نہ سوچا کہ یہ چھوٹے چھوٹے جملے اس کی شخصیت کو کس بری طرح مسخ کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں زبیدہ بیگم کے دل کے کسی بھی گوشے میں اس کے لیے ماما کیوں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ رہ گئے حمید صاحب تو ان کا واسطہ بس اتنا تھا کہ اسکول کی ماہانہ رپورٹ کارڈ پر سائن کر دیتے اور اچھے نمبروں سے پاس ہونے پر اس کی پیٹھ تھپتھپا دیتے۔ رفتہ رفتہ وہ تنہائی پسند ہوتی گئی لوگوں سے ملنے جلنے سے کترانے لگی تمام لوگ بڑے ذوق وشوق سے تقریبات میں جاتے لیکن وہ گھر میں رہنے کو ترجیح دیتی۔ صرف اسکول ایسی جگہ تھی جہاں وہ قدرے سکون محسوس کرتی کیونکہ یہاں اس کی ہم جماعت لڑکیاں اور استانیاں اس کی ذہانت اور شائستگی کی وجہ سے اس کی قدر کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی گئی اور وقت گزرتا رہا۔ شکیلہ انٹر کر چکی تھی عابد بی ایس سی کر رہا تھا سلیم نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور اجالا نے بہت اچھے نمبروں کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کر لیا تھا۔ اس نے اس کالج میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا تھا جہاں شکیلہ پڑھتی تھی اسے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے شکیلہ کے کالج میں داخلہ لیا تو وہاں بھی صورتحال وہی ہو جائے گی جو گھر میں تھی چنانچہ اس نے ضد کر کے ایسے کالج میں داخلہ لیا جو گھر سے خاصا دور تھا۔ ماں نے بہت سمجھایا کہ وہ قریب کے کالج میں داخلہ لے لے لیکن اس کی ضد کے آگے ایک نہ چلی۔ گھر والوں کے رویوں کا وہ اپنی ضد ہی سے مقابلہ کرتی تھی اور اس طرح ان کے رویوں کا انتقام لیتی تھی جس کام کو کرنے کے لیے اس سے کہا جاتا اسی کام کو نظر انداز کرنا اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ کالج میں داخلہ اسے بہت آسانی سے مل گیا اس نے اپنے مضامین میں فائن آرٹ کو ترجیح دی اس کا ارادہ آئندہ اسی مضمون میں ماسٹر ڈگری لینے کا تھا آہستہ آہستہ اپنی ذہانت کی بدولت کالج کے اساتذہ میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جانے لگی غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی اس طرح اس کی شخصیت کا ایک اور چھپا ہوا پہلو سامنے آیا وہ گھر میں جتنی خاموش اور افسردہ رہتی تھی اتنی ہی کالج میں خوش لیکن اپنے کالے رنگ کا احساس جو بچپن سے اس کے دل میں پیدا کر دیا گیا تھا اس نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا جب دو چار لڑکیاں باتیں کرتے کرتے اچانک اس کی طرف دیکھنے لگتیں اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس

کے کالے رنگ اور شکل وصورت پر باتیں کر رہی ہوں.... لیکن پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ یہاں گھر کا کوئی فرد نہ تھا جو اسے بات بات پر اس کی بدصورتی کا احساس دلائے کالج سے جب وہ گھر آتی ڈھیروں کام اس کے منتظر رہتے شکیلہ نازوں کی پلی تھی اس لیے ماں اور دادی اسے کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں پھر وہ تھی بھی پہلوٹھی کی اولاد اس کا جتنا بھی لاڈ کیا جاتا کم تھا اور رہ گئی اجالا تو وہ سب سے چھوٹی اور آخری اولاد تھی اس کے حصے کا پیار پہلے ہی بہن بھائیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے باورچی خانہ میں ماں اور دادی کا ہاتھ بھی بٹانا پڑتا تھا خصوصاً رات کے کھانے کی تمام ذمہ داری اس پر تھی کبھی کبھی اسے شکیلہ سے شدید نفرت ہونے لگتی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اسے اس کے حصے کا پیار نہ مل سکا تھا اور کبھی تمام بہن بھائیوں سے حسد ہوتا تھا۔

شکیلہ کی منگنی میٹرک کے بعد ہی اس کے پھوپھی زاد شہاب سے ہو گئی تھی انٹر کے بعد سسرال والوں کی طرف سے دباؤ کی بناء پر وہ ماں باپ اور دادی کا ڈھیروں پیار اور جہیز لیے اپنے گھر سدھار گئی۔ دو سال کے عرصے میں وہ اپنے ہی جیسی خوبصورت چاند سے چہرے والی بیٹی کی ماں بن گئی۔ اسپتال میں جب اجالا بہن اور بھانجی کو دیکھنے گئی اور وہاں جھولے میں پڑی جاپانی گڑیا کو گود میں اٹھا کر پیار کیا تو شہاب ہنس کر بولا۔ ''دیکھنا بھئی ذرا سنبھل کے.... کہیں ہماری بیٹی پر اپنے رنگ کا سایہ نہ ڈال دینا۔'' دوسرے ہی لمحے اس نے بچی کو واپس جھولے میں ڈال دیا جیسے واقعی اس کے چھونے سے وہ کالی ہو جائے گی۔ دن گزرتے رہے اب زبیدہ بیگم اور ان کی ساس کو اجالا کی فکر کھائے جا رہی تھی اس کی ہم عمر لڑکیاں تمام کی تمام بیاہی جا چکی تھیں لیکن اس کے لیے کسی نے بھی سوال نہیں ڈالا تھا وہ گریجویشن کر چکی تھی اور اب یونیورسٹی میں داخلے کے لیے سوچ رہی تھی فائن آرٹس میں ماسٹرز ڈگری کا خیال اس نے چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس سبجیکٹ میں پیسہ بہت چاہیے تھا۔ ایک ایک رنگ کی ٹیوب اور برش اتنے مہنگے آتے تھے کہ اسے بار بار ماں سے پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی تھی ہر بار جب ان سے کینوس ایزل رنگوں اور برش کے لیے رقم مانگی اچھی خاصی تقریر اسے سننی پڑی جبکہ اس کا فن روز بروز نکھرتا جا رہا تھا وہ بہت اچھی تصویریں بنانے لگی تھی خصوصاً لینڈ اسکیپ بنانے میں اس کا فن نکھر کر سامنے آتا۔ لیکن اس کی فکر

کس کو تھی۔ بس ہر بار اسے مہنگائی کا طعنہ سننا پڑتا تھا اس سے پہلے کہ اس کی تعلیم بند کر دی جائے اس نے عاقبت اسی میں سمجھی کہ مضمون بدل لے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ تصویریں بنانے کا خیال اس نے اس وقت تک کے لیے ترک کر دیا جب تک اس کی کہیں ملازمت نہیں ہو جاتی ادھر گھر والے دن رات اس فکر میں تھے کہ کس طرح اُس کا بوجھ سر سے اترے۔ وہ شکیلہ تو تھی نہیں جس پر جوان ہوتے ہی بیری کی طرح پتھر آنے لگتے اس خدشہ کا اظہار انہوں نے اپنی بہن سے بھی کیا اور چند دن بعد ان کی بہن نے ایک رشتہ بتایا پچپن سالہ اشفاق کا جس کی بیوی تین بچے چھوڑ کر مر گئی تھی اور سب سے چھوٹا بچہ صرف دو سال کا تھا۔ وہ ایک دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ زبیدہ بیگم نے بات سن کر کہا۔

''کمال کرتی ہو رابعہ تم بھی۔ تین بچوں کا باپ ادھیڑ عمر اور تنخواہ صرف پانچ ہزار روپے نہ خاندانی جائداد اور نہ کوئی اثاثہ کس بوتے پہ بیاہ دوں آخر کالی ہے تو کیا ہوا؟.... ہے تو میرا ہی خون اگر ایک آنکھ شکیلہ ہے تو دوسری اجالا میں یہ کیسے برداشت کر لوں کہ ایک بہن تو راج کرے اور دوسری ڈھنگ کے کپڑوں کو بھی ترسے۔ تم نے کچھ تو سوچا ہوتا بات کرنے سے پہلے۔''

آج نہ جانے کیسے ان کی مدتوں کی سوئی ہوئی ممتا جاگ پڑی تھی۔

''اس سے اچھا رشتہ تو ملنا بہت مشکل ہے۔ اچھا لڑکا ڈھونڈو گی تو اس کے گھر والے بھی خوبصورت لڑکی کا مطالبہ کریں گے۔ یہاں تو بیٹوں کی مائیں خود کو چنگیز خان کی اولاد سمجھتی ہیں جس کا جی چاہا عزت کا جنازہ نکال دیا جس کی چاہی پگڑی اچھال دی۔ لڑکیاں دیکھنے کے بہانے ہر گھر میں جا کر دعوتیں اڑاتی ہیں اور اپنے کالے کلوٹے بیٹوں کے لیے پرستان کی پریاں ڈھونڈتی ہیں۔ یہ تو خود اشفاق سے میں نے تذکرہ کیا تھا۔ وہ تو مرد ہے اس کے لیے رشتوں کی کیا کمی بھلا۔'' رابعہ خالہ نے پان منہ میں رکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

دوسرے کمرے میں لیٹی اجالا ساری گفتگو سن رہی تھی آج اسے ماں کی گفتگو سن کر ایک عجیب طمانیت کا احساس ہوا تھا اسے ایسا لگا جیسے وہ اسپتال میں بدلی نہ ہو بلکہ زبیدہ بیگم ہی اس کی اصل ماں ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے شدت سے اپنے کالے رنگ کا احساس ہو رہا تھا وہ

آہستہ آہستہ روتی رہی اور پھر اس نے ہمیشہ کیلئے اکیلے رہنے کا فیصلہ کرلیا.... گھر میں جیسے بھونچال آگیا۔

''اسی لیے تو کہتی تھی کہ زیادہ نہ پڑھاؤ۔ نامراد لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر بے باک اور بے شرم ہوگئی ہے۔'' دادی اماں نے لتاڑا۔

''کالی رنگت پہ یہ مزاج ہیں اگر کہیں کچھ خوبصورت ہوتی تو کیا کرتی بدنصیب۔'' زبیدہ بیگم نے چڑ کر کہا۔

''واقعی اتنی مشکل سے تو ایک رشتہ ہاتھ آیا تھا بہتر یہی تھا کہ پوچھے بغیر ہاں کردی جاتی کم از کم ان کا بوجھ تو کم ہوتا۔'' عابد بولا۔ اسے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ اجالا گھر سے نکلے تو اس کی باری آئے کیونکہ وہ اپنی ایک کولیگ سے شادی کا وعدہ کر بیٹھا تھا پھر اسے سروس کرتے ہوئے بھی تین سال ہوگئے تھے۔

''امی جان اگر آپ اجالا کی شادی کر بھی دیں تو وہ ایک اچھی بیوی کبھی ثابت نہیں ہوسکتی.... کیونکہ وہ مغرور بہت ہے۔ آج ہماری شادی کو تین سال ہوگئے لیکن اس نے کبھی مجھ سے سالیوں کی طرح مذاق نہیں کیا.... مجھے دیکھتے ہی ادھر ادھر ہوجاتی ہے۔ یا تو محترمہ کمرے میں ملیں گی یا کچن میں اور وہ بھی منہ بسورے۔ اسی کو کہتے ہیں شکل چڑیلوں کی لیکن مزاج پریوں کے۔'' شہاب نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

''شہاب آپ کو اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔'' شکیلہ کو جانے کیسے بہن کا خیال آگیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب اس تذکرے کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔ زبردستی ٹھیک نہیں ہے کچھ وقت گزرنے کے بعد شاید سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' حمید صاحب نے اپنی رائے دی۔ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کاش ان کی یہ بیٹی اتنی کالی نہ ہوتی یہ تو وہ معاشرہ ہے جہاں نہ خاندان دیکھا جاتا ہے نہ شرافت اور سگھڑاپا۔ بس گوری چمڑی چاہیے۔ چاہے بعد میں اس گوری چمڑی پہ چیچک ہی کیوں نہ نکل آئے۔

اجالا دوسرے کمرے میں سب کے ریمارکس سن رہی تھی۔ وہ کیسے بتاتی کہ اسے تو شروع ہی سے اس قابل نہ سمجھا گیا کہ وہ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ گھل مل کر مذاق کرتی اسکی حیثیت

تو ہمیشہ جملہ معترضہ کی سی رہی وہ کیسے بتاتی کہ وہ شہاب کو جو نہ صرف اس کا بہنوئی بلکہ پھوپھی زاد بھائی بھی ہے دیکھتے ہی کیوں ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔ عین شادی والے دن جب شہاب زنانے میں بلایا گیا تو اسے گھیر لیا گیا آرسی مصحف کے بعد سلامی کی باری آئی تو وہ دور کھڑی دیکھتی رہی جب شہاب نے اسے دور کھڑے دیکھا تو ہنس کر بولا۔

''بھئی ان لیلائے ظلمت کو بھی بلا لو تا کہ ہم انہیں نیگ دے سکیں .... کہ ہمارے نصیب میں بس ایک ہی سالی تھی وہ بھی اتنی ... اور جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔ قریب کھڑی ہوئی دوسری لڑکیاں شہاب کی بات سمجھ کر ہنس پڑیں اور وہ آنکھوں کے گوشوں میں آنسو چھپائے کمرے میں چلی گئی اور جب تک برات واپس نہ چلی گئی وہ یونہی اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی رہی لیکن کسی نے بھی اس کی کمی کو محسوس نہ کیا۔ صبح کو جب رشتہ دار لڑکیاں شکیلہ کو لینے سسرال جانے لگیں اور اجالا کو زبیدہ بیگم نے تیار ہونے کو کہا تو وہ سر درد کا بہانا کر کے رک گئی اور ایک بار جب اس نے عابد سے کہا۔

''بھیا اب شادی کر لو تا کہ ہمارے گھر بھی بھابی آجائے۔'' تو عابد نے ہنس کر کہا۔

''کیوں اپنی جیسی کوئی کوئل ڈھونڈ لی ہے کیا۔؟''

اور یوں قدم قدم پر اس کا مذاق اڑایا گیا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ہزاروں موقعوں پر اس کے دل کو ہزاروں بار توڑا گیا اور یہ سب اس کے اپنے ہی کرتے تھے جن سے اس کا خونی رشتہ تھا۔

ایم اے کا آخری سال تھا وہ دن رات پڑھائی میں غرق رہتی تا کہ فرسٹ کلاس آسکے اور کوئی ڈھنگ کی جاب مل سکے ایک دن گھر آئی تو مہمان خانے کی صفائی ہو رہی تھی اس نے ماں سے پوچھا۔

''کوئی آرہا ہے امی۔''

''ہاں تمہارے تایا زاد بھائی ابدال آرہے ہیں ان کی نوکری اسی شہر میں لگی ہے اس لیے جب تک گھر کا انتظام نہیں ہو جاتا وہ یہیں رہیں گے۔''

دوسرے دن ابدال اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ اجالا کے ہاں منتقل ہو گیا سانولے رنگ اور درمیانے قد و قامت کا منحنی سا ابدال ایک نظر میں بالکل اچھا نہ لگتا تھا لیکن جوں جوں وہ لوگوں

سے کھلتا جاتا تھا اس کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی جاتی تھی وہ بڑا مہذب اور پر مزاح تھا۔ خاصا پڑھا لکھا اور ادب سے گہرا لگاؤ رکھنے والا۔ آتے ہی اس نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ روزانہ رات کے کھانے کے بعد سب لوگ جب دادی اماں کے کمرے میں جمع ہوتے تو وہ بڑے مزے مزے کی باتیں کرتا ادب اور سیاست اس کے خاص دلچسپی کے موضوعات تھے حمید صاحب عابد اور سلیم کے علاوہ دادی اماں اور زبیدہ بیگم بھی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتیں لیکن وہ ہمیشہ خود ہی اسے نظر انداز کر دیتی۔ سوائے سلام کرنے کے اس نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ عام طور پر رات کو جب سب یکجا ہوتے تو وہ عموماً اپنی پینٹ کی ہوئی تصویریں دیکھتی اور اس وقت کا انتظار کرتی جب وہ مہنگے برش اور رنگ خریدنے کے قابل ہو جائے گی یا پھر فون پر اپنی قریبی دوست شانتی سے باتیں کرتی جو قریب ہی رہتی تھی اور اکثر دونوں ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتیں۔

ایک دن جب وہ کچن میں کچے قیمے کے کباب بنا رہی تھی ابدال کہیں سے آ نکلا۔

''اگر مائنڈ نہ کریں تو ایک کپ کافی یا چائے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟'' وہ شوخی سے بولا۔

''جی بہتر.... ابھی دیتی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور تھوڑی دیر بعد چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھما کر جانے لگی۔

''ذرا رکیئے'' ابدال نے پکارا۔

''جی فرمایئے'' وہ جاتے جاتے رک گئی۔

''آپ اتنی الگ تھلگ اور خاموش کیوں رہتی ہیں؟ مجھے آئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے ہیں لیکن آپ نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی.... آخر کیوں؟''

''بس ایسے ہی میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے زیادہ شور ہنگامہ بھیڑ بھڑ کا مجھے پسند نہیں... پھر فرصت بھی نہیں ملتی یونیورسٹی سے آ کر گھر کا کام۔ اپنی پڑھائی وغیرہ۔'' اس نے جلدی سے بات ختم کی۔

''آپ تصویریں بہت اچھی بناتی ہیں کمال کی.... لیکن آپ نے یہ مشغلہ ترک کیوں کر دیا؟''

اسے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ ''آپ نے دیکھی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں ایک دن عابد نے دکھائی تھیں۔ آپ کو یہ سلسلہ ترک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ

کے اندر تو بڑا ٹیلنٹ ہے۔''

اچانک چولہے پر کچھ جلنے کی بو نے اسے کچن کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ بھاگی ہوئی ادھر چلی گئی۔ چولہے پر دیگچی میں پڑی پیاز جل کر کوئلہ ہوگئی تھی وہ چولہا بند کر کے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ پانی کا ہاتھ لگا لگا کر قیمہ کے کباب بنانے لگی لیکن اس کے کانوں میں ابدال کے کہے لفظ گونجنے لگے اسے اچھا لگا بہت ہی اچھا کہ کسی نے اس کی ذات کا نوٹس لیا۔ اس کے کام کو سراہا۔

اسی دن، رات کو جب حسب معمول سب دادی کے کمرے میں بیٹھے تھے وہ سب کے لیے قہوہ لے کر کمرے میں گئی تو ابدال نے قہوے میں لیموں نچوڑتے ہوئے زبیدہ بیگم سے کہا۔

''کیا بات ہے چچی جان آپ کی بیٹی کچھ آدم بیزار ہیں؟'' جو یہ کبھی ہمارے ساتھ نہیں بیٹھتیں۔ یا پھر انہیں میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''ارے نہیں ابدال میاں ایسی بات نہیں بس یہ ہے ذرا اکل کھری۔'' دادی اماں نے جواب دینا ضروری سمجھا۔

''بیٹھو بھئی اجالا ایسا بھی کیا ہر وقت تم یا تو کمرے میں گھسی رہتی ہو یا پھر کچن میں ہوتی ہو آخر گھر والوں کو بھی تو کچھ وقت دیا کرو۔'' ابدال نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ مروتاً وہیں بیٹھ گئی۔ تب اسے ایک خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔ ابدال سب سے اس کی تصویروں کی تعریف کر رہا تھا اس کا خیال تھا کہ اگر اجالا اپنی مشق جاری رکھتی تو یقیناً بہت بڑی مصورہ بن کر ابھرتی۔ تب ہی زبیدہ بیگم نے بتایا کہ گھریلو مجبوریوں کی بناء پر خود انہوں نے اس کا یہ شوق چھڑوا دیا تھا۔

اگلے دن وہ یونیورسٹی سے آ کر کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی حمید صاحب عابد اور سلیم باہر تھے دادی اماں اور زبیدہ بیگم سو رہی تھیں کہ ابدال آ گیا۔ وہ فوراً ہی کچن کی طرف چلدی تا کہ اس کے لیے کچھ کھانے کے لیے لا سکے۔ وہ جب نمک پارے اور چائے لے کر اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ اخبار پڑھ رہا تھا اس نے تپائی نزدیک کر کے ٹرے اس پہ رکھی اور واپس جانے کے لیے جیسے ہی مڑی ابدال کی آواز نے اسے روک دیا۔

''سنئے۔''

''جی فرمایئے۔'' وہ رک گئی۔

''بھئی ذرا بیٹھے تو سہی آپ تو ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار رہتی ہیں۔'' ابدال نے ہنس کر کہا۔

وہ انجانے میں مسکرانے لگی۔

''پلیز اجالا آپ اطمینان سے بیٹھ جایئے۔'' ابدال نے خوش دلی سے کہا۔

وہ آرام کرسی پر ٹک گئی۔ ''جی فرمایئے کیا کام ہے۔ مجھے ذرا کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔''

''ارے بھئی فرمانا ورمانا کیا۔ سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔ میں تمہارا کزن ہوں وہ بھی فرسٹ کزن یہ الگ بات ہے کہ مختلف شہروں میں رہنے کی وجہ سے بہت طویل عرصے بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں.... لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اجنبیوں کی طرح.... جی.... جناب.... فرمایئے تک اپنی گفتگو کو محدود رکھیں۔''

''جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔'' وہ حیران ہوتی جا رہی تھی۔

''بھئی سیدھی سی بات ہے اور وہ یہ کہ میں تمہاری شخصیت سے بہت متاثر ہوں اور تمہارے ٹیلنٹ کی قدر کرتا ہوں.... یہ دیکھو میں تمہارے لیے کچھ برش اور رنگ لے کر آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم فارغ اوقات میں تصویریں بناؤ۔ آرٹس کونسل میں میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں اس سے کہہ کر تمہاری تصاویر کی نمائش کا اہتمام کرواؤں گا اور یہ بھی بتا دوں کہ میں خود بھی وہاں کا ممبر بننے والا ہوں۔ میری ایک کلاس فیلو وہاں کی جوائنٹ سیکرٹری ہے اور طالب علموں کو پھول بنانا سکھاتی ہے۔''

''ابدال نے بات ختم کر کے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا''۔

''لیکن ابدال بھائی مجھے وقت کہاں ملتا ہے اب.... یونیورسٹی سے آ کر گھر کا کام میرا منتظر رہتا ہے.... پھر امی شاید یہ پسند نہ کریں۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

اس کی تم فکر نہ کرو... چچی جان سے میں نے پوچھ لیا تھا.... ان کا کہنا تھا کہ اگر تم دوبارہ یہ سلسلہ شروع کر دو تو وہ برتن جھاڑو کے لیے ملازمہ رکھ لیں گی۔ تم صرف روٹیاں پکا لیا کرنا اور شام

کی چائے کی ذمہ داری لے لینا۔'' ابدال نے کہا۔

''کیا واقعی امی نے ایسا کہا ہے؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں بھئی میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''ہر بات کا جواب دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بعض باتیں خود ہی سمجھ لینی چاہئیں۔''

ابدال نے خوشدلی سے کہا۔

اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگا ابدال کی منحنی سی شخصیت ایک دم سے اچھی لگنے لگی وہ حیران حیران سی کمرے سے باہر آ گئی۔

☆.....O....☆

اف اللہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے کیوں ہر وقت ابدال کا خیال رہنے لگا ہے کیوں وہ مجھ سے اتنی ہمدردی کرتا ہے؟ کیوں وہ میرے لیے کینوس برش اور کلر لے کر آتا ہے...؟ کیوں وہ میرے لیے ادب اور شاعری کی اچھی اچھی کتابیں اور ناول لے کر آتا ہے۔''

اجالا مسلسل حیران ہوئے جا رہی تھی۔ آخر اس نے اپنی رازدار سہیلی شانتی سے اس کا ذکر کیا۔

''پاگل وہ تجھے چاہنے لگا ہے۔'' شانتی نے فوراً ہی فیصلہ سنا دیا۔

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔'' اجالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''کیوں نہیں ہو سکتا۔'' شانتی چڑ کر بولی۔

''اس لیے کہ مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کر سکتا... میں اتنی کالی جو ہوں۔''

''اچھا تو سن.....!! اگر تو کالی ہے تو وہ کون سا پرستان کا شہزادہ ہے۔''

''دیکھنے میں بالکل بندر لگتا ہے۔'' شانتی ہنستے ہوئے بولی۔

''ایسا تو نہ کہو'' اسے برا لگا۔

''دیکھ تو نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیدیا۔'' شانتی بولی۔

اور وہ اس طرح کہ ابدال دیکھنے میں نہایت ہی معمولی شکل وصورت کا مالک ہے چھوٹا قد،

چھوٹی چھوٹی آنکھیں، دبلا پتلا سا جسم اور سانولا رنگ... لیکن تو نے اسے من کی آنکھوں سے دیکھا ہے... تو کیا وہ تجھے نہیں چاہ سکتا؟''

اجالا کو ایک دم جیسے کچھ یاد آ گیا... ''ایک بات بتاؤں تجھے شانتی! ہوا یوں کہ پرسوں وہ میرے لیے کچھ کتابیں لایا۔ ان میں ایک کتاب تھی ''لیلیٰ کے خطوط'' قاضی عبدالغفار کی بہت دلچسپ کتاب ہے جب میں پڑھ رہی تھی تو دیکھا چند سطروں کو اس نے ''انڈر لائن'' کیا ہوا ہے اس وقت تو مجھے کچھ خیال نہ آیا لیکن اس وقت تمہاری بات سے مجھے وہ سطریں یاد آ گئیں۔''

''کیا تھا ان سطروں میں۔'' شانتی نے بے چینی سے پوچھا۔

''جو سطریں انڈر لائن تھیں ان میں لکھا تھا.... ''حسن تو کھال کے نیچے ہوتا ہے لیکن لوگ اسے کھال کے اوپر تلاش کرتے ہیں'' اور زیادہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔'' اجالا نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''بس تو معاملہ صاف ہے کہ اس نے تمہارے اندر کی شخصیت کے حسن کو محسوس کر لیا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے بعد ابدال دوسرا شخص ہوگا جس نے تمہارے اندر کی خوبصورت شخصیت کو پہچان لیا۔'' شانتی نے اسے گلے لگا لیا۔

اجالا تمام رات نہایت حسین سپنے دیکھتی رہی۔ ایک خوبصورت گھر جہاں وہ اور ابدال ہونگے۔ ہر طرف خوشیاں رقصاں ہونگی۔ صبح وہ سو کر اٹھی تو اپنے سرہانے گلاب کی کلی رکھی دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ بھلا یہ کلی کہاں سے آئی؟ یقیناً ابدال نے رکھی ہوگی اس نے سوچا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھی .... ابدال کتنا مختلف ہے دوسروں سے۔ اس نے اس کے رنگ سے قطع نظر اس کے دل میں جھانکا تھا اس کی سیرت و کردار کو چاہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ پریشان تھی وہ چاہتی تھی ابدال کھل کر اس سے بات کرے وہ کہے۔

''اجالا میں تم کو چاہتا ہوں تم سے پیار کرتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ یہی سوچتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تو امی سامنے ہی نظر آ گئیں وہ سلام کر کے غسل خانے میں جا گھسی اسے باہر سے دادی اماں کی آواز سنائی دی۔

''دلہن آج کل اجالا کچھ تمیز دار نہیں ہو گئی۔''

''ہاں ہو تو گئی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں اس کی بدتمیزی کی وجہ.... اب کالا رنگ اس نے اپنا خود تو نہیں کر لیا نا اماں جان جیسا قدرت نے بنا دیا وہ بن گئی... اگر اپنا رنگ روپ منتخب کرنا انسان کے اپنے بس میں ہوتا تو آج کوئی بھی کالا یا بدصورت نہ ہوتا۔'' زبیدہ بیگم نے کہا۔

اجالا کو ایک خوشگوار حیرت نے آ گھیرا وہ جواب سننے کے لیے غسل خانے میں مزید رک گئی اسے دادی اماں کی آواز سنائی دی۔

''لیکن دلہن یہ انکشاف تم پر کب ہوا کہ کالے رنگ میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔''

''بس وہ ابدال نے احساس دلایا اس بات کا... وہ کہتا ہے کہ ہم لوگوں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور اس ناروا رویہ کی بناء پر وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہو گئی ہے۔''

''اے دلہن مجھے تو لگتا ہے بات کچھ اور ہے... ابدال تمہاری کلو کو پسند کرنے لگا ہے... مجھے کئی دنوں سے شک ہو رہا تھا' اس کا تم سے سفارش کرنا' اس کا کام کروانا' کام والی کا بندوبست کروانا' تا کہ اسے پڑھائی کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔'' دادی اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہو جائے تو میرے سر سے کتنا بڑا بوجھ اتر جائے گا... اماں آپ دعا کیجئے کہ آپ کی یہ پوتی میری زندگی میں اپنے گھر کی ہو جائے۔'' زبیدہ بیگم کی آواز رندھ گئی۔

وہ تیار ہو کر یونیورسٹی پہنچی تو شانتی اور نوشابہ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ہی مل گئیں اسے دیکھتے ہی شانتی آگے بڑھی۔

''اجالا یار تجھے پتہ ہے وہ اکنامکس والی عارفہ کی شادی ہو رہی ہے۔''

''عارفہ کی شادی؟ بھلا کس سے۔'' اجالا نے پوچھا۔

''حسنین سے۔'' نوشابہ نے فوراً جواب دیا۔

''حسنین سے!!'' اجالا کی حیرت کی انتہا نہ رہی...

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''بنو سب کچھ ممکن ہے اس دنیا میں۔'' شانتی بولی۔

''مگر یار.... وہ تو.... بالکل ہی گئی گزری ہے میری طرح... اور حسنین.... وہ تو بہت

اسمارٹ ہے ... کہیں تم لوگوں نے غلط تو نہیں سنا۔"

"نہیں ہم نے بالکل غلط نہیں سنا تم چونکہ آج ذرا دیر سے آئی ہو اس لیے تمہیں یقین نہیں آرہا ورنہ آدھے گھنٹے پہلے حسنین خود یہاں کھڑا مبارکباد وصول کر رہا تھا۔" شانتی بولی۔

"لیکن پھر بھی تعجب کی بات تو ہے نا۔" اجالا نے مسرت سے کہا.... وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ عارفہ جو شکل وصورت کے لحاظ سے بالکل ہی گئی گزری ہے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حسنین جیسا خوش شکل اور اسمارٹ لڑکا اس سے شادی کرے ہاں البتہ یہ بات ضرور تھی کہ عارفہ الٹرا ماڈرن تھی جدید تراش خراش کے لباس پہنتی تھی اور ہر روز نت نئے ہیر اسٹائل بنا کر آتی تھی۔

"تمہارے تعجب کی وجہ میں جانتی ہوں۔" شانتی نے اسے خیالوں کے جزیرے سے باہر نکالا۔

"کیا مطلب"؟.... وہ چونک پڑی۔

"مطلب یہ کہ عارفہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے وہ اپنی اسپورٹس کار میں یونیورسٹی آتی ہے تین ملیں ہیں اس کے باپ کی... اور حسنین ایک متوسط گھرانے کا فرد ہے جس کی تین چھوٹی بہنیں اور دو بھائی ہیں... بات اب تمہاری کھوپڑی میں آ گئی ہو گی کہ دولت ہر عیب چھپا لیتی ہے۔" شانتی نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

اور وہ سوچنے لگی کہ اللہ کی شان بھی نرالی ہے جس کو دولت دیتا ہے اسے سب کچھ دے دیتا ہے کیا چیز ہے یہ دولت بھی جادو کی پڑیا کی طرح اثر دکھاتی ہے۔ کاش میرے ابا کے پاس بھی دولت ہوتی تو میں بھی کسی گھر میں راج کر رہی ہوتی یوں ماں، باپ کی چھاتی پر مونگ نہ دل رہی ہوتی۔ دوپہر کو جب وہ گھر پہنچی تو بار بار اسے عارفہ کا خیال آ رہا تھا لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ حسنین نے سودا کیا تھا اپنی شخصیت کا... تاکہ اپنی زندگی بھی بنا سکے اور اپنی بہنوں کے ہاتھ بھی عزت سے پیلے کر سکے۔

"آج کھانا نہیں کھاؤ گی کیا" ... زبیدہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی آج سے پہلے تو انہوں نے کبھی کھانے کو نہیں پوچھا یقیناً یہ بھی ابدال کی باتوں کا نتیجہ ہے۔

''اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو .... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔'' زبیدہ بیگم نے اس کا ماتھا چھوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں امی آپ کھانا نکال دیجئے میں وہیں آ رہی ہوں... بس ذرا کپڑے بدل لوں۔''... اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

شام کو ابدال آفس سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ پیکٹ تھے اس نے ایک پیکٹ دادی اماں کو دیا ایک زبیدہ بیگم کو اور تیسرا پیکٹ اجالا کی طرف بڑھا دیا... ''کیا ہے اس میں''... اس نے پوچھا۔

''بھئی آج پہلی تاریخ ہے اور مجھے پہلی تنخواہ ملی ہے اس لیے سب کے لیے کچھ نہ کچھ لایا ہوں''۔ ابدال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اجالا نے محسوس کیا کہ امی اور دادی جان نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اب اکثر یہ ہوتا کہ اجالا بھی ابدال کے کہنے سے تمام گھر والوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جانے لگی اپنی پہلی تنخواہ کی خوشی میں ابدال سب کو کباب پراٹھا کھلانے لے گیا تو وہ بھی ساتھ تھی اور وہی آسمانی لباس پہنا جو ابدال اس کے لیے لایا تھا وہ رات کے کھانے کے بعد اب سب گھر والوں کے ساتھ مل کر گفتگو میں بھی حصہ لیتی تھی اور حمید صاحب یہ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ ان کی بیٹی جس کو انہوں نے بچپن سے لے کر آج تک کبھی توجہ کے قابل نہ سمجھا تھا ادب' آرٹ اور سیاست پہ بہت اچھی اور بھرپور گفتگو کرتی ہے اور یہ سب ابدال کی وجہ سے ہوا تھا جو اسے زندگی کی طرف گھسیٹ لایا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اجالا کے پکائے کھانوں کی تعریف کرتا اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی حوصلہ افزائی کرتا اور اس کے ادبی ذوق کو سراہتا۔

''اجالا اب تک تمہاری کتنی تصاویر تیار ہو چکی ہیں''۔ ایک دن ابدال نے پوچھا۔

''یہی کوئی سترہ ہو گئی ہیں آٹھ لینڈ اسکیپ اور باقی دوسری۔''

''تم ایسا کرو پانچ تصویریں اور بنا لو پھر میں اگلے مہینے تمہاری تصویروں کی نمائش کی بات کرتا ہوں.... دراصل اگلے ماہ ساجد حسین اور افروز اقبال کی تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے میں نے تمہارا نام بھی دیدیا ہے۔ بس تھوڑے سے پیسے خرچ ہوں گے .... تم بس فوراً تیاری

شروع کر دو'' ابدال نے ایک دن کھانے کے دوران کہا۔

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے.... تم فوراً تیاری شروع کر دو۔'' حمید صاحب نے بھی حوصلہ افزائی کی۔

''مگر میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ اتنی جلدی پانچ تصویریں بنا ڈالوں۔'' اس نے عذر پیش کیا۔

''بھئی تم دو تین دن یونیورسٹی سے چھٹی کر لو۔'' عابد بھائی بولے۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا... اس عرصے میں تم گھر کا کوئی بھی کام نہ کرنا بس سکون سے تصویریں بنانا۔'' زبیدہ بیگم نے پیار سے کہا۔

''جی اچھا''... اس نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں آ گئی... اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دوزانو ہو کر ابدال کے قدم چوم لے جس نے تمام گھر والوں کو اتنا بدل دیا تھا کہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سب وہی ہیں جو ہمیشہ اس کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔

''ایسا اس لیے ہے کہ ابدال خود بھی بے چارہ نہایت معمولی شکل وصورت کا ہے اور شاید وہ بھی اپنے گھر والوں کے تکلیف دہ رویوں کا شکار رہا ہو۔'' اس نے سوچا۔

وہ سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ تو بس ابدال ہی کے متعلق سوچے جا رہی تھی یہ بھی اچھا تھا کہ وہ بہت خوبصورت نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ اجالا کی طرف کبھی توجہ نہ دیتا وہ سوچتی رہی اچانک اسے دوسرے کمرے سے سلیم کے ہنسنے کی آواز آئی۔

''واہ مزہ آ جائے گا اگر ایسا ہو جائے تو... اللہ نے ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔''

''چپ بدتمیز... کہیں وہ سن نہ لے۔'' زبیدہ بیگم کی آواز میں تنبیہ تھی۔ وہ سسک پڑی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ سلیم کا اس جملے سے کیا مطلب تھا۔

اس نے دن رات ایک کر کے ایک مہینے میں پانچ تصویریں مکمل کر لیں ان میں سے تین تصویریں تو وہ تھیں جن پر اس نے گزشتہ دنوں کام شروع کر رکھا تھا البتہ دو بالکل نئی تھیں اور یہ منی ایچر پینٹنگز تھیں تمام تصاویر ابدال نے آرٹس کونسل پہنچا دی تھیں لیکن باوجود ہزار کوشش کے اجالا

نمائش والے دن خود وہاں جانے کو تیار نہیں ہوئی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خوف اب بھی جاگزیں تھا کہ کہیں لوگ اسے دیکھ کر اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ خدا خدا کر کے تین دن کے بعد نمائش ختم ہوئی اور اسے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ اس کی تصاویر کو ناقدین فن نے سراہا اور خاص کر اس کی ایک تصویر ''اداس لڑکی'' کو فن کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا گیا۔ ایک دن باتوں باتوں میں دادی اماں نے ابدال سے کہا۔ ''بیٹا اب تم شادی کر لو..... خیر سے نوکری بھی پکی ہے اور عنقریب تمہیں گھر بھی دفتر کی طرف سے مل جائے گا۔''

''اگلے مہینے امی یہاں آ رہی ہیں۔ آپ یہ بات ان سے کیجئے گا۔'' ابدال نے مسکرا کر کہا پھر تقریباً بیس بائیس دن بعد اجالا کی تائی اماں اور ابدال کی والدہ آ گئیں آنے کے دو چار دن بعد دادی اماں نے ان سے جب ابدال کی شادی کا تذکرہ چھیڑا تو وہ کہنے لگیں۔

''ہاں میں اسی لیے آئی ہوں تاکہ اس کا گھر آباد کر سکوں۔''

''کوئی لڑکی دیکھی'' زبیدہ بیگم نے پوچھا۔

''نہیں میں نے تو ابھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی البتہ جہاں ابدال کہے گا وہیں کروں گی آخر زندگی تو اس کو ہی گذارنی ہے... ویسے زبیدہ ابھی کسی سے ذکر نہ کرنا مجھے ابدال نے بلوایا ہی اسی لیے ہے کہ وہ اس لڑکی کو دکھا سکے جسے وہ پسند کرتا ہے۔''

اجالا دل میں امیدوں کے چراغ جلائے اپنے کمرے میں آ گئی اپنی تصویروں کی نمائش کی خوشی میں اس نے ابدال کے لیے ایک خوبصورت اور مسحور کن خوشبو کو برا خریدی تھی وہ اسے خود دینا چاہتی تھی کہ اتنی دیر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اس نے بڑھ کر فون اٹھایا۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''جی میں ویکلی ''افسانہ'' کے دفتر سے بول رہا ہوں... پرسوں آپ کی تصاویر کی نمائش دیکھی تھی میں اس نمائش پر فیچر بنا رہا ہوں ازراہ کرم مجھے کچھ وقت دیجئے تاکہ میں آپ کا انٹرویو لے سکوں۔''

''جی میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی آپ مجھے اپنا فون نمبر لکھوا دیجئے۔''

اجالا نے کہا... اور شام کو جب ابدال آیا تو موقع پا کر اس نے انٹرویو والی بات بتائی...

ابدال یہ سن کر بہت خوش ہوا تب اجالا نے ''کوبرا'' کی شیشی اس کے سامنے رکھ دی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خوشی کے موقع پر جو آپ ہی کی وجہ سے مجھے ملا ہے آپ کو کیا دوں ... پھر میں نے سوچا کہ خوشبو سے بہتر تحفہ اور کیا ہوگا۔''

''اوہ...!!! ونڈر فل!... تو یہ میرے لیے ہے؟... بھئی واہ بہت خوبصورت، بہت ہی پیارا ہے... ہاں تم کچھ اپنے انٹرویو کی بات کر رہی تھیں۔ وہ خوشدلی سے بولا۔

ہاں ابدال بھائی وہ میں انٹرویو نہیں دینا چاہ رہی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''پھر وہی اوٹ پٹانگ باتیں۔'' ابدال نے سرزنش کی...

''دیکھو اجالا یہ گوشہ نشینی اور منفی رویہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ خدا کے لیے اپنے خول سے باہر نکلو... دنیا اتنی بری نہیں جو تم جیسی اچھی لڑکی اور ایک اچھی آرٹسٹ کی قدر نہ کرے... تم فوراً فون کر کے اس نمائندہ کو ٹائم دو اور اگر وہ تصاویر بنانا چاہے تو وہ بھی بنوا لینا'' ابدال نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں اجالا نے فون کر کے ''ویکلی افسانہ'' کے نمائندے کو اگلے دن کا وقت دے دیا اور خود ماں سے کہہ کر کچھ دیر کے لیے شانتی کے گھر چلی گئی۔ شانتی اسے دیکھتے ہی بولی۔

''آج سب تمہیں یونیورسٹی میں پوچھ رہے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے تمہیں ایک پارٹی دینے کی بات ہو رہی تھی... سر حامد تمہیں کئی بار پوچھ چکے تھے کہ تم اب تک یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں۔''

شانتی کی بات سن کر اسے اچھا لگا اس نے انٹرویو والی بات اسے بتا کر یہ بھی بتایا کہ تائی امی ابدال کی شادی کرنے آئی ہیں اور یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ ابدال نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے۔''

''اوہو مبارک ہو بنو... بس اب دلہن بننے کی تیاری کرو... دیکھو میں نہ کہتی تھی ابدال تمہیں چاہتا ہے۔''... شانتی نے خوش ہو کر کہا۔

''مگر شانتی انہوں نے کبھی کھل کے تو اس بارے میں کچھ نہیں کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''بالکل ہی بدھو ہو... ارے بھئی جب اماں جان کو بلوالیا ہے تو اب باقی کیا رہ گیا ہوسکتا ہے وہ تمہیں سرپرائز دینا چاہتا ہو۔'' شانتی نے کہا۔

''شاید!!''

وہ جب گھر آئی تو خاصی دیر ہو چکی تھی تائی اماں کہیں گئی ہوئی تھیں زبیدہ بیگم کچن میں تھیں اور دادی اماں تخت پر بیٹھی سروتے سے چھالیہ کتر رہی تھیں حمیدالدین اور دونوں بیٹے ابھی گھر نہیں لوٹے تھے اور ابدال ماں کو لے کر کہیں گیا تھا وہ خاموشی سے جا کر کمرے میں لیٹ گئی اسی وقت مغرب کی اذان کی آواز آئی اس نے اٹھ کر فوراً وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی نماز ختم کرنے کے بعد اس نے بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''یاالٰہی میرے دل کی دنیا آباد کر دے... اے پروردگار مجھے اندھیروں میں بھٹکنے سے بچا لے.. ابدال کے دل میں میری محبت اگر ہے تو اسے میری زندگی کا ساتھی بنا دے.... پروردگار میں نے آج تک تجھ سے کچھ نہیں مانگا میرا دامن ہمیشہ خوشیوں سے خالی رہا.... مگر کیوں؟ میرے مالک کیوں؟ کیا میں تیری بندی نہیں اس کالے رنگ نے میرا مقدر بھی تاریک کر دیا ہے... میرے ماں باپ میری فکر میں گھلے جاتے ہیں الٰہی یا تو مجھے آباد کر دے... ورنہ مجھے موت دیدے... یہ روز روز تھوڑا تھوڑا زہر مجھ سے نہیں پیا جاتا''۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اسی وقت زبیدہ بیگم نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا... وہ جلدی سے منہ پر ہاتھ پھیر کے کھڑی ہوگئی... دوپٹے سے آنسو خشک کیے اور دروازہ کھول دیا زبیدہ بیگم اندر آگئیں۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی فرمایئے...'' وہ ادب سے بولی۔

''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ابدال تمہیں پسند کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ غالباً اس لیے وہ بھابی جان کو ساتھ لایا ہے... تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر وہ سوال ڈالیں تو کیا میں ہاں کر دوں۔''

انہوں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی'' وہ آہستہ سے بولی۔

زبیدہ بیگم واپس چلی گئیں۔ایک اطمینان کی لہر اس کے وجود میں اتر گئی...

''میرے مالک....!!.... کیا تو واقعی میری دعا قبول کرے گا؟''.... اس نے دل ہی دل میں سوال کیا۔

☆..... o.....☆

دوسرے دن جب وہ یونیورسٹی جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ ابدال نے اس کے کمرے میں آ کر اسے چونکا دیا۔ ''سنو اجالا... میں نے آج شام انٹرویو کے لیے ٹائم دیدیا ہے... میں بھی تمہارے ساتھ موجود رہوں گا یہ انٹرویو سنڈے ایڈیشن میں چھپے گا اس کے علاوہ آرٹس کونسل والوں کے پاس تمہارا اندراج باقاعدہ کروادیا ہے۔ تین ماہ بعد ایک اور تصویری نمائش ہوگی اگر اس عرصے میں تم نے تصاویر بنائیں تو وہ ان کو بھی اس نمائش میں پیش کریں گے۔''

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی.... ابدال اپنی بات ختم کر کے واپس چلا گیا لیکن جس بات کو وہ اپنے کانوں سے سننا چاہتی تھی اس کا کہیں پتہ نہ تھا... ''شاید یہ بات وہ بڑوں کے توسط سے کرنا چاہتا ہے۔''

اس کے دل نے تسلی دی اور وہ اطمینان سے یونیورسٹی چلی گئی شام کو مقررہ وقت پر ویکلی ''افسانہ'' کا نمائندہ اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ آ گیا ابدال بھی موجود تھا اجالا آف وہائٹ شلوار قمیض میں خاصی اچھی لگ رہی تھی کانوں میں پڑے آویزوں نے اس کی شخصیت کو اجاگر کر دیا تھا ہونٹوں پر لگی ہلکی براؤن لپ اسٹک اس نے ابدال ہی کے کہنے سے لگائی تھی ہفت روزہ کا نمائندہ نہایت شائستہ اور سلجھا ہوا نوجوان تھا اس نے آرٹ سے متعلق خاصی اچھی گفتگو اجالا سے کی اور آخر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ واقعی ایک پیدائشی فنکارہ ہے اور اسے اپنا یہ کام جاری رکھنا چاہیے انٹرویو کے ساتھ ساتھ فوٹو گرافر نے تین چار تصاویر بھی بنائیں جن میں سے ایک میں ابدال بھی اس کے ساتھ تھا جب وہ دونوں چلے گئے تو ابدال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھا...!!... کتنا اچھا انٹرویو دیا ہے تم نے... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی دبّو

قسم کی لڑکی ہے جو ہر کسی سے ڈر جاتی ہے... میں تم سے کہتا تھا کہ اپنے خول سے باہر نکلو تم میں بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں انہیں دنیا کے سامنے لاؤ''۔

''لیکن ابدال بھائی میں یہ سب آپ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتی تھی... اگر آپ نہ ہوتے تو... وہ کہتے کہتے اٹک گئی۔

''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں...'' ابدال نے سنجیدگی سے کہا اسی وقت تائی اماں نے کمرے میں داخل ہو کر کہا... ''ابدال مجھے ذرا تم سے کچھ کام ہے فرصت ہو جائے تو آ جانا۔''

''جی بس مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔ اجالا کا انٹرویو تو ختم ہو چکا ہم لوگ بس آ ہی رہے تھے۔''

''ارے ہاں... مجھے تو یاد ہی نہ رہا کہ آج میری بچی کا انٹرویو لینے اخبار والے آ رہے ہیں ... کب آئے گا بیٹا یہ انٹرویو۔'' تائی اماں نے اجالا کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''امی یہ انٹرویو اتوار کو آئے گا آج سے ٹھیک چھ دن بعد۔'' ابدال نے کہا اور اماں کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

اگلے دن جب اجالا یونیورسٹی سے واپس آئی تو دادی اماں زبیدہ بیگم سے رازدارانہ طور پر کچھ باتیں کر رہی تھی اسے دیکھتے ہی بولیں۔

''اجالا تم کھانا کھالو... تھوڑی دیر کے لیے بازار چلنا ہے کچھ کپڑے وغیرہ لینے ہیں تم جلدی کھانا کھا کر فارغ ہو جاؤ۔'' زبیدہ بیگم نے کہا۔

ایک گھنٹے کے بعد جب وہ ماں کے ساتھ بازار پہنچی تو زبیدہ بیگم نے چھ سات جوڑے اس کے لیے خرید لیے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ماں سے پوچھے کہ کیا تائی اماں نے اُس کا رشتہ مانگ لیا ہے؟... لیکن حجاب نے اس کی زبان نہ کھلنے دی البتہ اسے اندازہ ضرور ہو گیا۔ دادی اور ماں کا سر جوڑے گفتگو کرنا زبیدہ بیگم کا خریداری کرنا اور ابدال کا کہنا... ''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔'' کپڑوں کی خریداری سے فارغ ہو کر وہ دونوں زیورات کی دکان پہ گئیں۔ زبیدہ بیگم نے اجالا کے لیے ایک خوبصورت سیٹ پسند کر لیا جو ان کے بجٹ کے مطابق تھا نہایت خوبصورت نزاکت سے بھرپور ڈیزائن والا نیکلس کانوں کے لمبے لمبے آویزے اور ہاتھوں کی چوڑیاں.. اب اسے

یقین ہو گیا کہ تائی امی نے بات کر لی ہے۔ وہ خوشی خوشی گھر واپس آئی اپنے کمرے میں جا کر سب سے پہلے اس نے شانتی کو فون کر کے ساری تفصیل بتائی اور خوبصورت خوابوں کی وادی میں سانس لینے لگی جہاں ابدال دولہا کے روپ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

دوسرے دن وہ دیر تک سوتی رہی دو دفعہ زبیدہ بیگم اسے دیکھ کر جا چکی تھیں لیکن وہ اتنی گہری نیند سو رہی تھی کہ ان کی ہمت نہ ہوئی اسے جگانے کی وہ واپس آ گئیں دادی اماں نے انہیں دیکھ کر کہا۔

''دلہن زیادہ بہتر تھا کہ تم پہلے اپنی جیٹھانی سے اس سلسلے میں صاف صاف بات کر لو باقی خریداری بعد میں کرنا... کہیں وہ مثل نہ ہو کہ ''بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیئے۔''

''اماں اس میں بھلا صاف صاف بات کرنے والی کیا بات ہے ابدال کا رجحان مسلسل اجالا کی طرف رہا ہے بھابھی جان کو اس نے خود بلوایا ہے اس کا رویہ بھی اجالا کے ساتھ اچھا ہے باتوں باتوں میں وہ یہ بھی کہہ چکی ہیں کہ ابدال کہیں لڑکی پسند کر چکا ہے.... اب اور کیا رہ جاتا ہے صاف صاف بات کرنے کے لیے میں آہستہ آہستہ خریداری اس لیے کر رہی ہوں کہ ایک دم سے پیسہ ہاتھ میں نہیں آتا ایک زیور کا سیٹ اور چھ جوڑے کل لے لیے بقیہ سامان بھی رفتہ رفتہ لے لوں گی کیونکہ بھابی جان ایک دم سے تاریخ مانگ لیں گی تب کیا ہو گا۔'' انہوں نے ابدال کی والدہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بات ختم کر دی اجالا تقریباً جاگ چکی تھی لیکن اس کا دل بستر سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا وہ کمرے میں پڑی پڑی ماں اور دادی کی گفتگو سن رہی تھی اور ساتھ ساتھ مستقبل کے تانے بانے بنتی جا رہی تھی اچانک تائی اماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''زبیدہ ابدال نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے وہ وہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اجالا کا رؤاں رؤاں کان بن گیا۔

''اے کون ہے وہ لڑکی''... دادی اماں کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''اماں... وہ اس کے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتی ہے.... آمنہ نام ہے اس کا، دیکھنے میں بڑی پیاری ہے۔''

تائی اماں نے ایٹم بم کا دھماکہ بڑی آسانی سے کر دیا وہ آسمان سے ایک دم گہرے کھڈ میں

جا گری۔

''لیکن تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا کہ ابدال اپنی کسی ساتھی کو پسند کرتا ہے ... ہم تو سمجھے تھے کہ وہ اجالا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' دادی اماں نے کہاان کا لہجہ خاصا تیز تھا۔

''نہیں امان جان... اجالا بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بھی پسند ہے لیکن ابدال نے کبھی بھولے سے یہ بات نہیں کہی... اس نے تو مجھے خط میں یہی لکھا تھا کہ وہ آمنہ سے شادی کرنا چاہتا ہے جو اس کے ساتھ کام کرتی ہے ہمارے جیسے متوسط طبقے کے لوگ ہیں ... لیکن لڑکی ہے بہت خوبصورت''... تائی اماں نے زخموں پر مزید نمک چھڑکا۔

''لیکن بھابی جان آپ کو آئے ہوئے کئی دن ہو گئے آپ نے آج اس بات کا تذکرہ کیا۔'' زبیدہ بیگم نے مردہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ پرسوں آمنہ کے گھر والوں نے ہاں کر دی ہے ... اور کل مٹھائی لے کر بات پکی کرنے جانا ہے ظاہر ہے تمہارے اور اماں جان کے بغیر مٹھائی لے کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... دوسری بات یہ ہے کہ ابدال نے کہا تھا جب تک آمنہ کے گھر والے ہاں نہیں کر دیتے یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے کیونکہ اس کے دو رشتے اور بھی آئے ہوئے تھے۔'' انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''تو کب جانا ہے مٹھائی لے کر۔'' دادی اماں نے دوبارہ پوچھا۔

''میں نے کل شام چھ بجے کا وقت دیدیا ہے۔'' تائی اماں نے جواب دیا۔ ''اچھا ہوتا اگر تم اجالا کو اپنی بہو بنا لیتیں... اپنا ہی خون ہے تمہارا اور تمہارے میاں کا بڑھاپا سکھ چین سے کٹ جاتا بڑی نیک بچی ہے وہ۔''

دادی اماں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے اماں جان ... لیکن میں کیا کروں یہ تو ابدال کی اپنی مرضی ہے ... میرا ایک ہی بیٹا ہے جہاں وہ کہے گا میں وہیں اس کی شادی کروں گی دونوں بہنیں بھی یہی چاہتی ہیں کہ شادی آمنہ سے ہو۔''

"تمہاری بچیوں نے آمنہ کو کب دیکھا... وہ تو اس شہر میں نہیں رہتیں۔" دادی اماں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ ابدال نے بہنوں کو آمنہ کی ایک تصویر بھیج دی تھی کچھ دن پہلے۔" تائی اماں بولیں۔

وہ ایک ایک لفظ کو بغور سن رہی تھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری کائنات روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہی ہو۔ اس کے اندر دھماکے ہو رہے تھے۔ جیسے اس کا دل بند ہو جائیگا۔ اس کی تمام تر قوت سلب ہو گئی تھی۔ آنسوؤں سے تکیہ بھیگ چکا تھا۔ دروازے پر آہٹ محسوس کر کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ زبیدہ بیگم ایک بار پھر اسے سوتا دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ خود ان کا دل بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی جیٹھانی نے انہیں تاریکی میں رکھا تھا۔ اگر وہ صاف صاف بات کر لیتیں تو ان کا اتنا نقصان نہ ہوتا بلا وجہ وہ ایک دن پہلے ہی خاصی لمبی رقم ضائع کر چکی تھیں۔ وہ یہی سوچتی ہوئی کچن میں چلی گئیں کہ اب ان زیور اور کپڑوں کا کیا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دوبارہ آ کر جب اجالا کو دیکھا تو وہ بے سدھ پڑی تھی اور اس کا پنڈا بخار میں تپ رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر اپنی ساس کو بتایا گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں تھا۔ تائی اماں بھی گھبرا کر اجالا کے کمرے میں آ گئیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو دو آنسو لڑھک کر اس کے چہرے پر پھیل گئے۔ زبیدہ بیگم ماں تھیں وہ بیٹی کی اندرونی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں لیکن مجبور تھیں اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ اتنی دیر میں دادی اماں اجالا کے لیے چائے اور ڈبل روٹی لے کر آ گئیں۔

"اسے اٹھاؤ اور زبردستی چائے اور ڈبل روٹی کھلاؤ خالی پیٹ تو کوئی دوا بھی نہیں دی جا سکتی۔" انہوں نے بہو سے کہا لیکن اجالا کو ہوش کہاں تھا جو وہ کچھ کھاتی پیتی۔ زبیدہ بیگم خود ڈاکٹر کو بلانے دوڑیں۔ تھوڑی دیر میں جب ڈاکٹر اجالا کو دیکھنے آیا تو وہ یونہی بے سدھ پڑی تھی دادی اماں مسلسل اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں اور تائی امی اس کے تلوے کپڑے سے جھس رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے بغور معائنہ کیا اور بولا۔

''ایسا لگتا ہے موسمی بخار کا اٹیک ہے۔ موسم بدل رہا ہے۔ مچھروں کی بہتات ہوگئی ہے۔ یہ بخار یونہی آناً فاناً چڑھتا ہے۔ میں ایک انجکشن لگا دیتا ہوں لیکن جیسے ہی کچھ ہوش آئے زبردستی کر کے کچھ کھلا پلا ضرور دیں اور شام کو مجھے ان کی حالت دوبارہ بتا دیں۔

''چلو خدا کا شکر ہے کوئی خاص بات نہیں۔'' دادی اماں نے کہا۔

''بھابی جان اب میں آپ کے ساتھ کل مٹھائی لے کر نہیں جا سکوں گی۔''

زبیدہ بیگم نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''میں ان لوگوں کو ابھی منع کرا دوں گی۔ آپ سب کے خصوصاً اجالا کے بغیر وہاں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابدال نے خاص طور سے کہا تھا کہ اجالا کو ضرور ساتھ لے کر جانا۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

زبیدہ بیگم دل پکڑ کر رہ گئیں۔ آج انہیں اپنی اس کالی کلوٹی بیٹی کی تقدیر پر رونا آ رہا تھا جس کی تقدیر پر پہلے خود انہوں نے سیاہی بکھیری بعد میں دوسروں نے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابدال کو دو تھپڑ لگائیں اور اس سے پوچھیں۔

''بتاؤ جب میری بیٹی سے تمہیں شادی نہیں کرنی تھی تو اس کی طرف بڑھے کیوں؟ ہم سب کو کیوں اس خوش فہمی میں مبتلا کیا کہ تم اسے چاہتے ہو؟ تمہیں اس کی پروا ہے؟ اگر میری بیٹی کا قصور اس کا کالا ہونا ہے تو تم کون سے شہزادے ہو؟ چھوٹا قد منحنی سا جسم!!'' وہ ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھیں کہ انہوں نے دیکھا دروازے پر شانتی کھڑی تھی اجالا جب یونیورسٹی نہیں پہنچی تو وہ پتہ کرنے گھر چلی آئی اجالا کی حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگئی۔ ابھی تک بخار کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے زبیدہ بیگم سے جب استفسار کیا تو وہ کچھ بھی نہ چھپا سکیں۔ وہ جانتی تھیں کہ شانتی ان کی بیٹی کی جگری دوست ہے۔ انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں کہ اجالا نے ابدال کی ماں کی تمام گفتگو سن لی ہے اور یہ اسی کا ردعمل ہے۔

ساری بات سن کر شانتی خود سناٹے میں آ گئی اسے ابدال پر سخت غصہ آ رہا تھا جس نے معصوم لڑکی کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا وہ خود کو بھی قصوروار سمجھ رہی تھی کہ اس نے بھی اجالا کو اس سلسلے میں

بڑھاوا دیا تھا اور اس کے دل میں پنپنے والی کونپل کو پھول بننے میں مدد دی تھی۔ وہ خاموش خاموش سی اجالا کے سرہانے بیٹھ گئی تھوڑی دیر بعد جب بخار کچھ کم ہوا تو اسے دودھ اور بسکٹ زبردستی کھلائے گئے۔ شانتی نے اجالا سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کی حالت اس کے دل کی بربادی کی داستان سنا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ بخار کچھ کم ہوا تو اس نے ماں کو بلایا اور بولی۔

''امی آپ میری ایک بات مان لیجئے۔ میں نے آج تک آپ سے کوئی ضد نہیں کی۔''

ماں بولی ''میری بچی... تو جو کہے گی وہ کروں گی۔'' ان کی مامتا بیدار ہو گئی تھی۔

''آپ کل ابدال بھائی کی بات پکی کرنے چلی جایئے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' اس نے آنسوؤں کو بہنے سے روکتے ہوئے کہا'

اسی وقت تائی اماں اندر داخل ہوئیں انہوں نے اجالا کی بات سن لی تھی۔

''نہیں میری بچی ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تم بخار میں پڑی رہو اور ہم تمہارے بنا بات پکی کر آئیں۔''

''نہیں تائی امی میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ کل ضرور جائیں۔ بدشگونی نہ کریں ورنہ مجھے دکھ ہوگا اور ابدال بھائی کی بھی یہی مرضی ہوگی۔ آپ کل ضرور جائیں اگر میرا بخار اتر گیا تو میں بھی چلوں گی۔ آپ فکر مت کریں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے... جیسے تمہاری مرضی'' تائی اماں نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

زبیدہ بیگم نے آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے لگا لیا۔ اس کے آنسوؤں نے جیسے آج نہ رکنے کی قسم کھائی تھی۔ شانتی نے دونوں ماں بیٹی کو الگ کیا اور خود اجالا کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ کچھ دیر بعد گھر پہنچے گی۔

شام کو بخار مزید کم ہو گیا۔ ابدال جب گھر آیا تو اسے اجالا کی خبر ملی۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا اجالا نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اب اس دشمن جاں کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی شام تائی اماں دو چار دوسرے رشتہ داروں کو اگلے دن کی تقریب کا بلاوا دینے چلی گئیں دادی اماں اور

زبیدہ بیگم کمرے میں بیٹھی حالات پر غور کر رہی تھیں جو اچانک تیزی سے بدل گئے تھے۔ حمید صاحب عابد اور سلیم ابھی گھر نہیں آئے تھے کہ شانتی اجالا کو سوتا جان کر تیزی سے اٹھی اور ابدال کو اس کے کمرے سے بلا لائی۔

''آپ دیکھ رہے ہیں جس لڑکی کو آپ صبح اچھا خاصا چھوڑ کر گئے تھے اور جو کل شام تک آپ کے ساتھ انٹرویو دیتے وقت بہت خوش تھی اس وقت بالکل بے سدھ پڑی ہے اور صبح سے اس کی حالت میں کوئی سدھار نہیں آیا ہے۔'' اس نے ابدال سے کہا۔

''ہاں میں خود پریشان ہوں کہ یہ کیا ہو گیا۔ امی بتا رہی تھیں کہ یہ موسمی بخار ہے جس کا اٹیک فوری ہوتا ہے۔'' ابدال نے کہا۔

''جی نہیں ابدال بھائی... یہ موسمی بخار نہیں ہے... یہ سب آپ کی کرم فرمائی اور آپ کی امی کا تحفہ ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''کیا مطلب... میں سمجھا نہیں۔''

''مطلب یہ کہ پہلے آپ نے اس کے دل میں اپنے پیار کی جوت جگائی اور پھر والدہ محترمہ کو کہیں اور رشتہ طے کرنے بھیج دیا۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو اس بدقسمت لڑکی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیوں کیا کہ آپ اسے چاہتے ہیں۔''

''لیکن میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ میں اسے چاہتا ہوں۔''

''کہا نہیں... لیکن آپ کے رویے اس بات کے غماز تھے کہ آپ اسے پیار کرنے لگے ہیں۔''

''وہ سب میں نے ارادتاً کیا تھا... تاکہ اس کی کچلی ہوئی شخصیت کا اعتماد بحال ہو سکے۔ میں جب دیکھتا تھا کہ اس کے ساتھ اس کے گھر والے کس قسم کا سلوک کرتے ہیں اور اس کی شخصیت کو کس کس طرح مجروح کرتے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہوتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اسے اس احساس کمتری سے نجات دلاؤں گا۔ بس اس سے زیادہ میں نے کچھ اور نہیں سوچا۔''

''مگر کیوں ابدال بھائی اگر آپ ایسا سوچ سکتے تھے۔ اگر آپ واقعی اس سے سچی ہمدردی رکھتے تھے تو آپ کو اس سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔''

''میں ضرور شادی کر لیتا... مگر... مگر.....وہ'' ابدال کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''بات یہ ہے شانتی کہ اگر اجالا کا رنگ اتنا کالا نہ ہوتا تو میں سوچ سکتا تھا۔''... ابدال نے بے زاری سے کہا۔

''کالا رنگ !!!'' شانتی پھٹ پڑی... ''اور آپ نے کبھی آئینے میں اپنا جائزہ لیا ہے؟ کہتے ہیں آئینے جھوٹ نہیں بولتے۔ تو جائیے اور جا کر دیکھئے آئینہ اور پھر بتائیے کہ آپ کی شخصیت کیسی ہے۔ اجالا کا تو صرف رنگ کالا ہے لیکن آپ... آپ کی تو شخصیت زیرو ہے۔ چھوٹا قد مُڑا تُڑا پچکا جسم، چھوٹی آنکھیں اس پر آپ کو چاہیے خوبصورت لڑکی...''

''میں مرد ہوں شانتی اور مرد کی شکل وصورت نہیں دیکھی جاتی بلکہ اس کی نوکری دیکھی جاتی ہے پیسہ دیکھا جاتا ہے جو میرے پاس ہے یہی وجہ ہے کہ آمنہ نے دوسرے رشتوں پر مجھے ترجیح دی۔''

''ٹھیک کہا آپ نے کہ آپ مرد ہیں اور انتخاب کا اختیار آپ کو ہے آپ قوت خرید رکھتے ہیں اس لیے جب اور جسے چاہیں رد کر سکتے ہیں لیکن آپ کو یہ کھیل نہیں کھیلنا چاہیے تھا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو... مجھے نہیں معلوم تھا کہ اجالا اتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو جائے گی۔''

''آپ اب بھی سوچ سکتے ہیں۔ ابدال بھائی ابھی آمنہ کے گھر رشتہ کے لیے آپ کی امی نہیں گئی ہیں۔'' شانتی نے کہا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ میں آمنہ سے محبت کرتا ہوں۔ پھر میری امی اور بہنیں بھی خوبصورت لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

اجالا جو چپ سادھے سب کچھ سن رہی تھی اسے ایسا لگا جیسے آسمان اس پر آن گرا ہو۔ ابدال ایک دم سے اس کی نظروں سے گر گیا جس شخص کو وہ دوسروں سے مختلف سمجھتی تھی وہ بھی ایک عام آدمی کی طرح نکلا۔

دوسرے دن سات خواتین اور تین مردوں کے ساتھ تائی اماں مٹھائی کا ٹوکرا اور پھولوں کا گہنا لے کر آمنہ کے گھر روانہ ہوئیں تو عابد اور سلیم اجالا کے پاس تھے۔ وہ بستر پر پڑی چھت کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ سے اٹھی اسٹور کی طرف بڑھی اور کیڑے مار دوائی کی بوتل اٹھا کر پوری پی

گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے گرم گرم کھولتی ہوئی لاوے کی مانند کوئی چیز اس کے حلق سے اتر گئی ہو وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔

رات کو تقریباً گیارہ بجے جب سب لوگ واپس آئے تو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی زبیدہ بیگم بولائی بولائی پھر رہی تھیں ابدال بھی ادھر ادھر اسے تلاش کر رہا تھا عابد اور سلیم بے خبر تھے کہ گھر والوں کے جانے کے بعد وہ تیز آواز میں گانے سن رہے تھے۔ اچانک حمید صاحب نے اسٹور میں جھانکا۔

''یہ رہی۔'' وہ چلائے۔

سب گھر والے اسٹور کی جانب بھاگے اسے اٹھا کر کمرے میں لائے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ابدال پاس ہی کھڑا تھا۔ سب ہی پریشان تھے۔ وجہ صرف ابدال جانتا تھا۔ ڈاکٹر آیا دیکھا انجکشن لگایا۔ الٹی کرانے کی کوشش کی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں جیسے کہنا چاہتی ہو:۔

''یہ دنیا میرے رہنے کے لائق نہیں۔''

اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

❀❀❀❀❀❀

شہر کو سیلاب لے گیا

بیس برس بعد وہ امریکہ سے آئی تھی اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کے ساتھ لیکن ان بیس برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا' کراچی وہ کراچی نہ رہا تھا۔ نہ اب وہ گلڈ کتاب گھر تھا جہاں وہ منصور سے ملی تھی۔ جہاں وہ ادیبوں اور شاعروں سے ملا کرتی تھی یونیورسٹی سے واپسی پر وہ بعض اوقات صدر کا پوائنٹ لے لیتی اور جب گلڈ کتاب گھر میں داخل ہوتی تو منصور کو بعض اوقات وہاں موجود پاتی جو مختلف شیلف میں سجی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا نظر آتا۔ وہ بھی پرانے ادبی رسائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی اور کتاب گھر کے منتظم کافی کم قیمت پر اسے وہ رسائل دے دیتے اور ساتھ ہی چائے بھی پلاتے۔ وہ ادب کی طالبہ تھی اور فکشن سے اسے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ وہ کہانیاں بھی لکھتی تھی اور ایک مقبول روزنامے میں طلبا کے صفحے پر اس کا کالم بھی چھپا کرتا تھا جو طلباء و طالبات میں بہت مقبول تھا' ایک دن جب وہ گلڈ کتاب گھر پہنچی تو منصور کاؤنٹر پر کھڑا یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے بات کر رہا تھا۔ وہ بھی سلام کر کے اپنے مطلوبہ شیلف کی جانب چلی گئی اور ایک ادبی پرچے کا افسانہ نمبر لے کر جب وہ کاؤنٹر پر آئی تو اچانک منصور نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ یقیناً آمنہ آفریدی ہیں جن کا کالم ہر جمعے کو طلبا کے صفحے پر چھپتا ہے؟''

اسے ایک لحہ کو منصور کی بے تکلفی پسند نہ آئی اس نے ناگواری سے اسے دیکھا' لیکن اچانک ہی اسے یاد آ گیا کہ کالم کے ساتھ اس کی تصویر بھی چھپتی ہے، اسی لیے اس نے پہچان لیا تھا۔

''ارے آمنہ تم انہیں نہیں جانتیں...؟ یہ منصور قاضی ہیں مشہور و معروف محقق قاضی احمد

میاں اختر صاحب کے بیٹے ۔ یہ خود بھی شاعر ہیں اور رسائل و اخبارات میں ان کے تنقیدی مضامین چھپتے رہتے ہیں۔"

تین چار دن بعد جب وہ سیما کے ساتھ گلڈ کتاب گھر پہنچی تا کہ اسے کچھ اچھی کتابیں دلوا سکے تو منصور پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ سیما سے بولی۔

"ایسا لگتا ہے جیسے اس شخص کو کوئی کام کاج نہیں جب دیکھو یہاں موجود۔"

"ابا نے جائیداد چھوڑی ہوگی، جو یہ بے فکری ہے۔" سیما نے لقمہ دیا۔

آمنہ کو اپنے تھیسس کے لیے کچھ کتابیں درکار تھیں جو کافی پرانی تھیں اور کہیں مل نہیں رہی تھیں۔ اس نے تمام بڑی بڑی لائبریریوں میں پتہ کر لیا لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی، اچانک اسے گلڈ کتاب گھر کے مہتمم کا خیال آیا وہ ان کے پاس پہنچی اور اپنی پرابلم بتائی تو وہ مسکرا کر بولے "شاید یہ کتابیں آپ کو منصور قاضی صاحب کے پاس مل جائیں، ان کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔"

☆..... ٥ .....☆

آرٹس کونسل کیفے گلرنگ میں لگی کونے والی ٹیبل پہ وہ منصور کے ساتھ بیٹھی کافی کے گھونٹ لے رہی تھی۔ دونوں حالیہ نمائش پر بات کر رہے تھے۔

اچانک دور بیٹھی فرخندہ دونوں کو دیکھ کر ان کے قریب آ گئی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی ؟؟" اس نے سوال کیا اور پھر خود ہی بولی "کیا ہو رہا ہوگا ؟" یہی قرۃ العین حیدر کے کسی ناول پر تبصرہ یا لتا کے کسی نئے گیت کی تعریف ... اور تو کسی بات کی تم دونوں سے توقع کی ہی نہیں جا سکتی۔"

وہ ہنستی ہوئی دروازے سے داخل ہوتی ہوئی خدیجہ کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں ہنس پڑے۔

"تم مجھے کتنے عرصے سے جانتی ہو۔" اچانک منصور نے سوال کیا۔

"یہ کیا سوال ہے بھلا اس وقت ؟"

"شاید یہی وقت مناسب ہے۔ یہ مدہم روشنی یہ ہلکی ہلکی موسیقی کی دھن اور یہ آرٹسٹک ماحول۔ منصور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا

''اگر یہ بات ہے تو سن لیجئے محترم میں آپ کو پورے چار سال سے نہایت اچھی طرح جانتی ہوں لیکن کسی کو جاننے کے لئے مُدت کوئی معنی نہیں رکھتی، بعض اوقات ایک ملاقات ہی کافی ہوتی ہے۔اور کبھی کبھی برسوں ساتھ رہ کر بھی انسان، انسان کو سمجھ نہیں پاتا''۔اُس نے لاپرواہی سے ہنس کر کہا۔

''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ ابھی تک سمجھ میں آیا ہوں یا نہیں''منصور نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' آمنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ''مطلب یہ کہ مجھ سے شادی کرو گی''؟ منصور نے پوچھا۔

☆..... O .....☆

شادی کے دو سال بعد ہی دونوں اپنے چھ ماہ کے بیٹے ابتسام کے ساتھ امریکہ شفٹ ہوگئے تھے آمنہ کے والد کے توسط سے منصور کو ایک بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ وہاں ایک بیٹا دانیال پیدا ہوا۔آمنہ نے بھی جاب کر لی تھی لکھنے لکھانے کا عمل بھی جاری تھا اس نے وہاں ایک ادبی کمیٹی بھی بنالی تھی جہاں ہر ماہ کسی نہ کسی کے گھر کوئی ادبی تقریب منعقد ہوتی۔کبھی یہ ادبی تقریب محفلِ غزل کا روپ دھار لیتی لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود دونوں وطن کو نہ بھلا سکے تھے اور پھر جب موقع ملا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وطن آنے کو تیار ہوگئے۔درمیان میں صرف منصور ایک بار اپنی والدہ کے انتقال پر آیا تھا۔بچے چھوٹے تھے اس لیے چاہنے کے باوجود وہ نہ آسکی اور اب وہ تھک چکی تھی نوکری اور گھر داری کرتے کرتے نہ یہاں نوکروں کی سہولت تھی نہ وہ عیاشی جو اپنے وطن میں تھی۔لگتا تھا سب کے سب وقت کے قیدی ہیں اور گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔نہ کسی کو کسی سے ملنے کا وقت نہ شوہروں کے دفتر اور بچوں کے اسکول جانے کے بعد پڑوسنوں سے یا فون پہ سہیلیوں سے گپ شپ' وہ دن رات کی مشقت سے تھک گئی تھی۔نوکری کرنا بھی مجبوری تھی ورنہ گھر میں اکیلی پڑے پڑے بھی کیا کرتی یہاں آکر تو بھنگنیں تک ''سیلز گرلز'' لگ گئی تھیں وہ تو پھر ایک بڑے اشاعتی ادارے میں اچھے عہدے پر کام

کرتی تھی لیکن ڈالر کی فراوانی کے باوجود اپنے اندر کچھ خالی پن کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اپنا ذاتی گھر ہوتے ہوئے پیسے بچانے کے لیے کرائے کے گھر میں رہ رہے ہوں، دونوں ہی اپنے احباب اور عزیز رشتہ داروں کو بہت مس کرتے تھے۔ انہیں اپنی ادبی محفل، مشاعرے اور دوسری تقریبات کا خیال شدت سے آتا تھا لیکن وہ مجبور تھے اچھے مستقبل کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے پھر جب وہ امریکی سوسائٹی کا حصہ بن کر بھی اجنبی رہے تو دونوں نے سوچا کم از کم اپنے بچوں کو ان کے قریبی رشتہ داروں سے تو ملوایا جائے جن سے وہ صرف تصویروں کی حد تک مانوس تھے، دونوں نے ڈالر بہت کما لئے تھے اور اب اپنے شہر میں اپنے وطن میں کچھ کرنا چاہتے تھے، چاہا تو دونوں نے یہی کہ تمام سرمایہ سمیٹ کر پاکستان کی راہ لیں ان سے زیادہ ان کے بچے وہاں کے دیوانے ہو رہے تھے جہاں لوگ ایک ہی گھر میں مل جل کر رہتے ہیں، وہ بھی تو جب بیاہ کر منصور کے گھر گئی تھی تو وہاں سب ہی تھے منصور کے دونوں بڑے بھائی، ان کی بیویاں بچے، ساس، سسر اور دادا جان، اسے یہ سب بہت اچھا لگا خود اس کے گھر میں دادی اماں تھیں ابا جان، اماں، آکا بھائی، ابرار بھائی اور دونوں بھابیاں، بھرا پرا کنبہ چھوڑ کر بھرے پرے گھر میں آئی تو اسے کچھ بھی اجنبی نہ لگا لیکن جب وہ امریکہ پہنچی تو مدتوں تک بستر میں منہ دے کے روتی رہتی تھی اور اکثر منصور سے کہتی۔

”مجھے واپس کراچی بھجوا دو... میرا دم گھٹتا ہے یہاں پر... بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آسائشوں کے پیچھے بھاگتے رہو اور جب وہ سب حاصل ہو جائے تو اتنا تھک جاؤ کہ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنے کو جی نہ چاہے۔“ تب منصور اسے سمجھاتا۔

”آمنہ میں یہاں صرف تمہاری خاطر آیا ہوں... میں نہیں چاہتا تھا کہ تم نے جو شروع سے ایک نہایت آرام دہ اور پر آسائش زندگی گزاری ہے اس میں کچھ فرق آئے... ہاں اگر تم کسی متوسط یا غریب گھر کی لڑکی ہوتیں تو اس کے لیے میری تنخواہ اور میرے ماں باپ کے وسیع گھر کا ایک کمرہ کافی تھا لیکن میں نے دیکھا تھا کہ جب تمہارا ڈھیروں جہیز ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا تو تمہاری آنکھوں میں ایک احساس محرمی تھا۔ پھر جب قدرت نے مجھے یہ موقع فراہم کیا تو اسے AVAIL

نہ کرنا حماقت تھی۔"

تم بھی عجیب ہو کہاں کی بات کو کہاں ملا دیا... یعنی آپ یہاں اس لیے آئے کہ میرے ڈھیروں جہیز کے رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کتنی چھوٹی بات سوچی تم نے... اور اگر ایسا ہی تھا تو جہیز تو اب بھی وہیں مختلف جگہوں پہ پڑا ہے جہاں پہلے تھا' حیرت ہے منصور تم نے مجھے اتنا کم ظرف سمجھا! یعنی اشیاء انسانوں پر فوقیت رکھتی ہیں؟... اگر میری یہ سوچ ہوتی تو میں اپنے جہیز کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا کر آتی یا پھر یہاں آنے سے پہلے فروخت کر دیتی۔"

وہ غصے سے پھٹ پڑی منصور نے اسے ایک دم اپنی ہی نظروں میں بہت چھوٹا کر دیا تھا۔ وہ آنسو پوچھتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔

"نہیں آمنہ تم غلط سمجھ رہی ہو... میرا یہ مقصد نہیں تھا دراصل میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا اور منہ سے الفاظ دوسرے نکل گئے منصور نے جاتی ہوئی آمنہ کو روک لیا اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا "میں یہاں صرف تمہاری اور اپنے بچوں کی خاطر آیا ہوں"، ورنہ یہاں دو نمبر کا شہری بن کر رہنا مجھے بھی اچھا نہیں لگتا، میں نے اور تم نے کبھی صرف پیسے کو اہمیت نہیں دی، ہمارے لیے رشتے زیادہ اہمیت رکھتے تھے، لیکن موجودہ دور اسٹیٹس کا دور ہے، میں نہیں چاہتا کہ میرے بچوں کو میرے بھائیوں کے بچوں کے مقابلے میں کمی کا احساس ہو!"

اور پھر جب سب کچھ سمیٹ کر انہوں نے وطن واپس آنا چاہا تو دوستوں نے سمجھایا کہ پہلے جا کر حالات کا جائزہ لو اور بعد میں یہاں آ کر وائنڈ اپ کرو۔ بلا سوچے سمجھے جمے جمائے کاروبار کو ختم کر کے چلے جانا مناسب نہیں، منصور کو یہ بات معقول لگی، لیکن آمنہ زیادہ جذباتی ہو رہی تھی اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ایئر پورٹ پر پورا خاندان اس کے لیے ہار لیے کھڑا ہو گا لیکن جب قائداعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر وہ اتری تو سوائے اس کے والد اور جیٹھ کے کوئی نہ تھا، سب کی اپنی اپنی مصروفیت تھی اور بقول منصور کے بڑے بھائی معظم کے انہیں جانا تو گھر ہی تھا ایئر پورٹ آ کر کیا کرتے۔

منصور کے اپنے گھر میں اب ان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی ان کے بیڈ روم اب بھائی کے بچوں

کے استعمال میں تھے، ان کے لیے چھت پر بنے ہوئے دو کمرے کھول دیئے گئے تھے، جو بوقت ضرورت گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی نے بھی کسی خاص ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ دنوں بھائی چاہتے تھے کہ اگر منصور یہاں کچھ کرنے اور مستقل رہنے کے ارادے سے آیا ہے تو معظم کی کنسٹرکشن کمپنی میں حصہ دار بن جائے یا منجھلے بھائی مسعود کی تولیہ فیکٹری کو سنبھالا دے جو کہ قرضے کے بوجھ تلے دبی تھی۔ آمنہ کو جس گرم جوشی کی امید تھی وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ منصور اپنا پیسہ کہاں لگائے گا، دونوں بچے بھی کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ یہ وہ لوگ تو نہیں ہیں جن کی محبتوں کے گن ان کے ماں باپ گایا کرتے تھے۔ جن سے وہ خیالوں میں پیار کرنے لگے تھے! اتنا لمبا سفر! اتنی امیدیں! اتنی مایوسی اور اتنا ڈیپریشن! آمنہ بولائی جا رہی تھی اور منصور سے نظریں چرا رہی تھی۔

''چلو شام کو تمہارے پاپا کے پاس چلتے ہیں۔'' منصور نے اس کی مشکل حل کر دی۔ اتنی دیر میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا شرفو چاچا انہیں کھانے کے لیے بلانے آئے، آمنہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ کھانا تیار ہونے والی گہما گہمی جو مہمانوں کے لیے ہوتی ہے بالکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے شرفو چاچا سے پوچھ ہی لیا تو وہ بڑے آرام سے بولے۔

''ارے بیٹا کیا پکنا اور کیا پکانا ایک ہفتے سے جو پک رہا تھا اسی میں سے ایک ایک ڈش آج کے لیے بہو بیگم نے رکھوا دی تھی ڈیپ فریزر میں وہی نکال کر گرم کر لی ہیں۔''

''اوہ...! یہاں بھی ڈیپ فریزر'' آمنہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ جب دونوں بچوں کے ساتھ منصور اور آمنہ نیچے آئے تو سب لوگ ڈائننگ ٹیبل پر جمع تھے اور کئی قسم کے کھانے اس پر چنے ہوئے تھے۔

''کیوں بھابی جان کیا آپ لوگوں نے تازہ کھانا پکا کر کھانا چھوڑ دیا ہے؟'' منصور نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ایسا تو نہیں ہے... خدا کا شکر ہے کہ روز تازہ کھانا ہی کھاتے ہیں لیکن ایک ڈش روز فریز کر دیتے ہیں اور جب بھی کوئی مہمان آتا ہے تو پکانے کے جھنجھٹ سے بچ جاتے ہیں اور

پھر ڈیپ فریزر ہوتے کس مقصد کے لیے ہیں... اسی لیے کہ انسان کو کچھ آرام مل سکے۔"

بڑی بھاوج نے کن اکھیوں سے دیورانی کو دیکھتے ہوئے کہا جو زیر لب مسکرا رہی تھیں۔

شام کو جب دونوں بچوں اور منصور کے ہمراہ آمنہ اپنے میکے پہنچی تو پتہ چلا کہ یہاں بھی چولہے الگ الگ ہو گئے ہیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد آمنہ کی بڑی بھاوج زرینہ نے اسے مشورہ دیا کہ منصور کو کہے کہ وہ یہاں ٹیکسٹائل مل لگا لے۔ آمنہ کے بڑے بھائی کا تجربہ اس کے کام آئے گا۔ اسی دوران موقع پاتے ہی چھوٹی بھاوج ساجدہ نے اسے بتایا کہ سجاد بھائی کی ٹیکسٹائل مل کئی ہفتوں سے بند پڑی ہے اسی لیے وہ سرمایہ گھسیٹنے کے لیے یہ مشورہ دے رہی تھیں۔ آمنہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی... یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے کسی کو اس کی اور اس کے بچوں کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں، کھانے کے بعد جب وہ گھر واپس آنے لگے تو طارق روڈ پر گاڑیوں کا اور لوگوں کا ایک اژدہام تھا۔ سڑک کے دونوں طرف شاپنگ سینٹرز کا ایک جنگل وجود میں آ گیا تھا، جہاں دو نمبر کے لوگ خریداری کر کے خوش ہو رہے تھے، ہیروئن کی اسمگلنگ اور ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کی کھپت اس بازار میں خوب تھی وہ جب بیس برس پہلے یہاں سے گئی تھی تو ایک قبرستان وہاں کی پہچان تھا، جس میں اس کی والدہ دادی اور ماموں محو خواب تھے یا پھر ایک جھیل پارک جو اب بھی تھا اور مین روڈ پر یونی ورسٹی کے پوائنٹ سے اتر کر وہ اُسی پارک سے ہوتی ہوئی اپنے گھر آتی تھی جہاں راستے میں بنگلہ دیش کی رہنے والی ایک مشہور فلمی ہیروئین کا گھر تھا، وہ خیالوں میں گم اپنے خوبصورت ماضی کی دلکش یادوں کو طارق روڈ کی سڑکوں پر تلاش کر رہی تھی کہ اچانک ایک ایمبولینس کے سائرن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایدھی ایمبولینس کا سائرن مسلسل بج رہا تھا لیکن کوئی اسے راستہ دینے پر تیار نہ تھا۔ وہ گاڑی سے سر نکال کر دیکھنے لگی...

"اللہ منصور یہ لوگ ایمبولینس کو راستہ کیوں نہیں دے رہے کہیں مریض بے چارہ مر ہی نہ جائے مسلسل سائرن اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ بات سیریس ہے لیکن یہاں تو ہر ایک کو جلدی ہے... یہ کیسا بے اماں شہر ہے منصور یہ تو اپنا کراچی لگتا ہی نہیں" اس نے افسردگی سے کہا۔

امریکہ میں تو اس نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا وہاں تو بلی بھی زخمی ہو جائے تو بحفاظت

اسے اسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔

☆....O....☆

اگلے دن آمنہ نے عابدہ سے ملنے کا پروگرام بنایا جو اس کی بہت پرانی دوست تھی اور اس کے ساتھ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک پڑھتی رہی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے اور اس کی پرورش نانا اور نانی نے کی تھی۔ غربت کی گود میں جنم لینے والی عابدہ یونیورسٹی سے سیدھی آمنہ کے ساتھ جب اس کے گھر آتی تو شام تک وہیں رہتی اور اس کے ساتھ لان میں بیٹھ کر ہار سنگھار، موتیا، گلاب اور چمبیلی کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتی۔ پھر عابدہ نے ایک سیاسی پارٹی کی طلبہ تنظیم جوائن کر لی وہیں اس کی ملاقات نعمان فاروقی سے ہوئی جو تنظیم کا سرگرم لیڈر تھا۔ ایم۔اے کرنے کے بعد اس نے نعمان سے شادی کر لی اور خود ایک اسپتال کے نفسیاتی علاج کے شعبے سے منسلک ہو گئی۔ یہ شادی نعمان کے والدین کی مرضی کے خلاف تھی گھر کی ساری ذمہ داری عابدہ پر تھی البتہ گھر والوں نے چھت پر دو کمرے کچن اور باتھ روم بنا کر دونوں کو دیدیئے تھے۔ آمنہ نے منصور کو ساتھ لیا اور دونوں عابدہ کے گھر کی طرف چل دیئے۔ وہ ناظم آباد میں اب بھی اسی گھر میں رہتی تھی۔ دونوں جب گھر سے نکلے تو جگہ جگہ پیزا ہٹ، آئس کریم پارلے، کباب اور برگر کی دوکانیں بے شمار تعداد میں انہیں نظر آئیں لیکن ان میں کوئی بھی دوکان کتابوں کی نہیں تھی۔ نوجوان لڑکے اور مرد مختلف رنگ کی پگڑیوں میں جا بجا نظر آ رہے تھے کھانے پینے کی تمام دوکانوں پہ ایسا رش تھا جیسے اشیاء مفت بٹ رہی ہوں۔ دماغوں کو اور ذہنوں کو رنگ برنگی پگڑیوں میں جکڑ دیا گیا تھا اور ''معدے'' آزاد ہو گئے تھے جیسے سارا شہر بھوکا ہو۔

بڑی مشکل سے وہ عابدہ کے گھر کے قریب پہنچی۔ ایک سو بیس گز کا سادہ سا گھر اب تین منزلہ بنگلے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گیٹ پر نعمان فاروقی ایم۔پی۔اے کی گولڈن نیم پلیٹ لگی تھی جس کی چمک دمک مکینوں کی خوشحالی کی گواہ تھی۔ بیل بجانے پر ملازم نے دروازہ کھولا اور مہمانوں کو ایک ایسے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جہاں فرانس کے ڈیکوریشن پیس ایرانی قالین، پیتل کے نہایت خوبصورت ناچتی ہوئی گڑیوں کے مجسمے، اعلیٰ درجے کی پینٹنگز اور نہ جانے کیا کیا؟ آمنہ کو

گھبراہٹ ہونے لگی، اسے ایسا لگا جیسے وہ غلطی سے کسی اور کے گھر میں آ گئی ہو، منصور الگ بور ہو رہا تھا تقریباً پندرہ منٹ بعد عابدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ دبلی پتلی عابدہ کی جگہ گول مٹول سی ایک عورت گہرے میک اپ اور قیمتی لباس میں داخل ہوئی، دونوں سہیلیاں بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملیں لیکن آمنہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی دوست کہیں گم ہو چکی ہے ایک دوسرے سے راز و نیاز کرنے والی سہیلیوں کے درمیان کوئی حائل ہو گیا تھا۔ عابدہ کے مالی حالت کو دیکھتے ہوئے منصور نے یونہی پوچھ لیا۔

''نعمان بھائی نے کیا کوئی بزنس کر لیا ہے؟''

''ہاں... وہ ایک ماچس فیکٹری لگائی ہے۔'' عابدہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''مگر تم نے تو لکھا تھا کہ مخالف پارٹی والے نعمان بھائی کو بہت تنگ کر رہے ہیں اور انہیں مختلف موقعوں پر تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ مگر دروازے پہ لگی ایم۔ پی۔ اے کی نیم پلیٹ اور گھر کی کنڈیشن تو کچھ اور کہہ رہی ہے، تم یقیناً کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے''.... آمنہ نے عابدہ کو کریدا۔

عابدہ نے آنکھوں پر سے چشمہ ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا اور آہستہ سے بولی ''خالی خولی آدرشوں سے پیٹ نہیں بھرتا آمنہ، نعمان ایک جیالے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے، لیکن اس پارٹی کے جو کبھی اقتدار میں نہیں رہی البتہ لوگوں کے دلوں پر اس پارٹی کی حکمرانی ضرور تھی میں اکیلے نوکری کرتے کرتے تھک گئی تھی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا یہ سب میری ذمہ داری تھے کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرنے کو نعمان تیار نہ تھے۔ پھر الیکشن آئے اور ایک پارٹی نے انہیں اس شرط پہ ٹکٹ دینے کو کہا کہ وہ اپنی سابقہ پارٹی چھوڑ دیں تو الیکشن جیتنے کے بعد اور بھی مراعات دے گی سو نعمان نے یہ پارٹی جوائن کر لی۔ الیکشن جیتنے کے بعد پارٹی لیڈر نے انہیں پارٹی کا نائب صدر بنا دیا ہے اور وزیر بھی، اب کچھ عرصے بعد ہم لوگ ڈیفنس شفٹ ہو جائیں گے اور یہ مکان کرائے پر دے دیں گے۔''

اس کے لہجے میں ایک ایسا فخر تھا جو عموماً ایسے لوگوں کو ہوتا ہے جنہوں نے غربت اور محرومی کو بہت قریب سے دیکھا ہو۔ آمنہ جو اپنی دوست سے ملنے گئی تھی بددل ہو کر جلد ہی وہاں سے اٹھ گئی۔ اسے اپنی دوست عابدہ کے بجائے ایک نو دولتیے ایم۔ پی۔ اے کی بیوی سے سابقہ پڑا جو

اس کے لیے نا قابل برداشت تھا۔

☆....o....☆

کئی دن کی سوچ بچار کے بعد اچانک منصور کو ایک ایسا پروجیکٹ مل گیا جو جما جمایا تھا، اس کا بچپن کا دوست فرید کینیڈا شفٹ ہو رہا تھا اور اپنا پرنٹنگ پریس بیچنا چاہتا تھا، دوسری طرف فرید کی بیوی منصور اور آمنہ کو مسلسل سمجھا رہی تھی کہ موجودہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر لوگ پاکستان سے باہر شفٹ ہو رہے ہیں ایسے میں وہ لوگ یہاں واپس آ کر اچھا نہیں کر رہے لیکن آمنہ اور منصور اب واپس جانے کے موڈ میں بالکل نہیں تھے۔ یہاں ان کی جڑیں تھیں ان کے لوگ تھے۔ ان کے بچپن کی یادیں تھیں۔ ان کی خوشحالی میں وطن کا بھی حصہ تھا جو وہ اسے دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایگریمنٹ تیار ہو گیا اور ایک صبح منصور بیس فیصد ادائیگی کے لیے ڈالر کیش کرانے گھر سے نکلا تو دانیال بھی ضد کر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گھر سے نکل کر جیسے ہی اس نے موڑ کاٹا اور گاڑی تھانے کے قریب پہنچی تو اچانک ایک پجیرو نے تیزی سے سامنے آ کر راستہ بلاک کر دیا، منصور نے گاڑی کو بریک لگایا اور اتنی دیر میں کہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے پجیرو میں سے ایک آدمی منہ پہ ڈھاٹا باندھے باہر آیا اس نے چیتے کی سی تیزی سے منصور کی گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا، دانیال کو بازو سے پکڑ کر باہر نکالا اور دوسرے ساتھی کے حوالے کر دیا جو پہلے ہی مستعد کھڑا تھا اور خود منصور کی طرف پستول تان کر بولا ”ٹھنڈے ٹھنڈے گھر چلے جاؤ.... اگر پولیس کو اطلاع دی تو یہ ضرور سوچ لینا کہ تھانہ یہاں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے۔“.... اتنا کہہ کر وہ تیزی سے گاڑی میں جا بیٹھا جو پہلے ہی اسٹارٹ کھڑی ہوئی تھی، دانیال کے رونے کی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں اور وہ ہکا بکا کھڑا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو کن لوگوں نے اور کیوں اغواء کیا ہے اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور پہلے سوچا کہ تھانے جا کر اطلاع دے لیکن چھٹی حس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ شاید اس کے پاس بھی اسلحہ ہوتا تو وہ ان مجرموں کا مقابلہ کرتا... ”عجیب ملک ہے یہ جہاں ایک شریف شہری نہتا ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کے پاس تمام تر ممنوعہ اور جدید ترین اسلحہ موجود ہے۔“

”لیکن ہمارے پاس تو اتنا سرمایہ بھی نہیں کہ لوگوں کی نظروں میں آئیں اور پھر ہمیں یہاں آئے ہوئے چند ہی دن تو ہوئے ہیں... کہیں کسی غلط فہمی کی بنیاد پر تو ایسا نہیں ہوا۔“ منصور نے گھر والوں سے کہا۔

”بیٹا تم لوگوں کے آنے کی خبریں تو محلے میں کئی ہفتوں سے پھیلی ہوئی تھیں اور لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس بار تم لوگ اپنا سارا سرمایہ سمیٹ کر یہاں آئے ہو اور یہاں کوئی کاروبار کرو گے۔“ آمنہ کے والد نے کہا۔

”لیکن پاپا ہم تو ابھی بہت کم رقم لے کر آئے ہیں۔ سارا کاروبار وائنڈ اپ کرنے میں وقت لگتا ہے۔ بیس فیصد کی ادائیگی کے بعد واپس جا کر ہم سرمایہ یہاں لائیں گے۔“... منصور نے جواب دیا۔

”ارے بھیا امریکہ سے ہمیشہ کے لیے آنا وہ بھی بیس برس بعد... لوگ تو یہ سمجھتے ہیں نا کہ لاکھوں ڈالر کی پارٹی ہے۔ بہت سوں کی نظریں ان ڈالروں پر ہوں گی جو تم دونوں نے دن رات ایک کر کے کمائے ہیں۔“

آمنہ کی بھاوج ساجدہ نے منصور کی بھابیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہاں یہ تو سچ ہے! کہ لوگوں کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہے تھے کہ کب منصور ڈالر کما کر یہاں آئے اور اس کے مال کو کس طرح ہڑپ کیا جائے۔“ منصور کی چھوٹی بھاوج نے جیٹھانی کی طرف چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی تین گھنٹیوں کے بعد منصور نے ریسیور اٹھایا اور فون سنتے ہی گالیوں پر اتر آیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور مسلسل مغلظات بک رہا تھا۔ اچانک آمنہ نے ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”دیکھئے آپ مجھ سے بات کیجئے میں بچے کی ماں ہوں۔“

اس نے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے بڑے ضبط سے کہا وہ منصور کے غصے سے ڈرتی تھی جو بلا سوچے سمجھے ہمیشہ ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ غصے میں وہ بالکل آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور پھر یہ تو اس کے بیٹے کا معاملہ تھا۔

''ہاں... '' دوسری طرف سے کسی نے ہنس کر کہا... '' آپ ماشاء اللہ کافی سمجھدار لگتی ہو۔ اپنے آدمی کو بھی سمجھاؤ کہ ایسے معاملوں میں غصہ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے... میں انہیں سمجھا دوں گی پلیز آپ بتایئے کہ ہمارا بیٹا کہاں ہے اور آپ نے اسے کیوں اٹھوایا ہے۔'' آمنہ نے روتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا بچہ بالکل محفوظ ہے چاکلیٹ کھا رہا ہے اور کارٹون دیکھ رہا ہے۔ یہ لیجئے آپ خود بات کر لیجئے۔''

''ممی میں دانیال بول رہاں ہوں۔'' ایک سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ممی مجھے جلدی سے یہاں سے لے جایئے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''بیٹا تم ٹھیک تو ہو... ان ظالموں نے تمہیں مارا پیٹا تو نہیں۔'' آمنہ نے بمشکل پوچھا۔

''نہیں مما... انکل نے مجھے جوس بھی پلایا اور کیڈ بری چاکلیٹ بھی دی لیکن مجھے یہاں اچھا نہیں لگ رہا آپ مجھے جلدی سے یہاں سے لے جایئے۔'' اور فون ڈس کنیکٹ ہو گیا۔ دانیال کی آواز سن کر آمنہ کو ایسا لگا جیسے برسوں کے پیاسے کو ایک گھونٹ پانی مل گیا ہو۔

''کیا ہوا بیٹا وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے۔'' آمنہ کے والد نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں... بس انہوں نے دانیال سے بات کروائی وہ خیریت سے ہے لیکن گھبرا رہا ہے۔'' آمنہ نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''مجھے بات کرنے دیتیں تو دماغ درست کر دیتا سالوں کے'' منصور نے غصے سے کہا۔

''ایسے موقعوں پر غصے کی نہیں تحمل کی ضرورت ہوتی ہے منصور!... تمہارے رویئے سے وہ دانیال کو نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔'' منصور کے بڑے بھائی نے کہا۔

اچانک فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار آمنہ نے اشارے سے سب کو منع کر دیا اور تیسری گھنٹی پہ فون اٹھا کر بولی۔

''جی فرمایئے۔''

''ارے فرمانا ورمانا کیا میڈم... ایسا لگتا ہے تمہیں بچے کی پرواہ نہیں ہے اسی لیے تیسری گھنٹی

یہ فون اٹھایا... اچھا سنو بس دس لاکھ دیدو اور بچہ لے لو۔" دوسری طرف سے مردانہ آواز گونجی۔

"دس لاکھ!" اچانک آمنہ کے منہ سے نکلا "اتنی بڑی رقم تو ہمارے پاس نہیں ہے... ہم کہاں سے دیں گے۔" وہ رو پڑی۔

"اے میڈم!... ایکٹنگ مت کرو... ہمیں معلوم ہے کہ تم لوگ بیس سال بعد امریکہ سے ادھر آیا ہے... وطن کی محبت میں"..... وہ ہنسا... "ادھر فیکٹری لگائے گا یا مل لگائے گا تمہارے پاس بہت مال ہے... پھر بھی ہم نے زیادہ نہیں مانگا ہے۔"

"جب آپ کو سب کچھ پتہ ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم نے ابھی امریکہ میں اپنا کاروبار ختم نہیں کیا ہے... ہم دو ماہ کے لیے کاروبار کا جائزہ لینے آئے ہیں۔ واپس جا کر تمام سرمایہ واپس لائیں گے۔" آمنہ نے شائستگی سے سمجھایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے... تب تک بچے کو ہمارے پاس رہنے دو۔ ہم اس کا پورا خیال رکھے گا۔ تم آرام سے جاؤ اپنا روپیہ لے کر ادھر آؤ اور اپنا بچہ لے جاؤ۔" دوسری طرف سے تمسخرانہ انداز میں کہا گیا۔

"نہیں نہیں ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا..... میں اپنے بچے کو تم لوگوں کے پاس نہیں چھوڑ سکتی کچھ انسان بنو... کچھ تو خیال کرو..." آمنہ گڑگڑائی۔

"ٹھیک ہے... دس کے بجائے آٹھ لاکھ دیدو... اس سے کم نہیں ہوگا... ہم شام چار بجے پھر فون کرے گا اگر رقم تیار ہے تو تمہیں بچہ مل جائے گا ورنہ تمہیں کل صبح گیارہ بجے تک پیسوں کا انتظام کرنا ہوگا۔"

"منصور وہ دس سے آٹھ پر رضا مند ہو گئے ہیں لیکن ہمارے پاس تو پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں اور ابھی واپس بھی جانا ہے۔" وہ رو پڑی۔

"دیکھو فی الحال تو فرید کو فون کر دو کہ ہم آج ایگریمنٹ سائن نہیں کر سکتے اور نہ ہی پے منٹ کر سکتے ہیں... میں کل رقم دیکھتا ہوں کتنی ہے... میرا خیال ہے ہمیں رقم کو بدلوانا نہیں چاہیے اس میں بھی خطرہ ہے..."

منصور نے آمنہ سے کہا اور پھر امید بھری نظروں سے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا ''اس وقت اگر آپ دونوں میری کچھ مدد کر دیں تو ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گا... اور امریکہ سے واپس آ کر آپ دونوں کی پائی پائی چکا دوں گا۔''

بھائی کے بجائے ان کی بیوی زرینہ بولیں... ''ارے بھئی۔ یہاں تو ہر چیز میں بارگیننگ ہوتی ہے... تمہیں ان سے تین لاکھ سے بات شروع کرنی چاہیے تھی تب وہ پانچ پر راضی ہو جاتے تم نے فوراً ان کی بات مان لی۔ میں تو کہتی ہوں اب فون آئے تو ان سے کہنا تمہارے پاس تین لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ دیکھو پھر وہ کیا کہتے ہیں۔''

''اگر دانیال کی جگہ آپ کا بیٹا ہوتا تب بھی آپ یہی کہتیں۔؟''

آمنہ کے وجود کی تمام کڑواہٹ اس کے لہجے میں آ گئی اور اسی لمحے اس نے ایک فیصلہ کر لیا وہ ہر قیمت پر اپنے بچے کو رات سے پہلے گھر لے آئے گی وہ تو آج تک کبھی ایک رات کے لیے بھی اس سے الگ نہیں سویا۔ خدا نہ کرے اگر اسے رات بھر وہاں رہنا پڑ گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن یہ سوچتے سوچتے وہ مکمل طور سے ایک نتیجہ پر پہنچ چکی تھی... لیکن اس نے اپنی سوچ میں کسی کو بھی حتی کہ منصور کو بھی شامل کرنا مناسب نہ سمجھا!... اسے ہر قیمت پر اپنے بیٹے کو واپس لانا تھا... اگلی کال کے انتظار میں منصور اور آمنہ کی جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی، گھر کے دوسرے افراد بھی پریشان تھے کسی نے بھی کچھ نہ کھایا تھا سب فکر مند تھے آخر کو انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور فون کی گھنٹی بجی آمنہ نے لپک کر ریسیور اٹھایا اسے ڈر تھا کہ اگر منصور نے فون اٹھایا تو وہ اپنی غصیلی طبیعت کی وجہ سے کام بگاڑ بھی سکتا ہے۔

''دیکھو میڈم تم روپیہ لے کر تھانے کی طرف چلو تمہارے ساتھ بس ایک آدمی اور ہونا چاہیے اور اگر تم نہ آنا چاہو تو پھر رقم لانے والا اکیلا ہی آئے گا... تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک کالے رنگ کی کار تمہارے پاس آ کر رکے گی، ڈرائیور تمہارے بچے کا نام بتا کر گاڑی کا دروازہ کھول دے گا۔ تم لوگ خاموشی سے بیٹھ جانا... اور ہاں دیکھو اگر تم نے کوئی بھی چالاکی برتنے کی کوشش کی تو...؟''

''میں جانتی ہوں اگر میں نے ایسا کیا تو تم میرے بچے کو زندہ نہیں چھوڑو گے۔''

''ٹھیک ہے تم کافی عقل مند لگتی ہو۔'' اور فون بند ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میاں بیوی رقم بغل میں دبائے آہستہ آہستہ گھر سے نکل کر متعلقہ جگہ کی طرف چل دیئے۔ آمنہ نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک سیاہ کار ان کے قریب آ کر رکی ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا دونوں خاموشی سے کار میں بیٹھ گئے، کار تیزی سے فراٹے بھرتی جا رہی تھی، تمام راستے اجنبی لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی ایک الگ تھلگ بنے ہوئے دو منزلہ بنگلے کے آگے رکی۔ گیٹ پر متعین دربان نے دروازہ کھولا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی، اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک سجے سجائے کمرے میں تھے جس کی زمین پر دبیز ایرانی قالین بچھا تھا، دیواروں پر آیت الکرسی اور یا حی یا قیوم کے بڑے بڑے طغرے لگے ہوئے تھے۔ دائیں جانب کی دیوار پہ خانہ کعبہ کی بہت بڑی تصویر لگی تھی، آمنہ آبدیدہ ہو گئی۔ اس نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اچانک ساگوان کی لکڑی کا بھاری بھرکم دروازہ کھلا اور ایک نہایت تندرست شخص چادر کندھے پہ ڈالے کمرے میں داخل ہوا، دونوں بے تابی سے کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھو بیٹھو'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا... ''رقم پوری لائے ہو؟''... آواز میں سختی تھی۔

''نہیں... ہمارے پاس بمشکل چھ لاکھ ہیں اور ابھی ہمیں امریکہ واپس بھی جانا ہے... لیکن آپ کا مطالبہ پورا کرنے کا ایک طریقہ ہے ہمارے پاس... امید ہے آپ ہماری بات کا یقین کریں گے۔''

آمنہ نے بغیر ڈرتے ہوئے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ منصور حیران نظروں سے بیوی کو دیکھ رہا تھا لیکن بولنے کی اس میں جیسے سکت ہی نہ تھی۔

''کیا تجویز ہے تمہارے پاس... جلدی بتاؤ۔'' بھاری بھرکم شخص نے اپنے دائیں ہاتھ سے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''فی الحال آپ پانچ لاکھ روپے اور میرے ہاتھوں کی چوڑیاں لے لیجیے... بقایا رقم ہم آپ کو کچھ دن بعد ادا کر دیں گے۔ آپ یہ رقم لے کر بچے کو اس کے باپ کے حوالے کر دیجیے، بقیہ رقم کی ادائیگی تک میں آپ کی قید میں رہنے کو تیار ہوں۔'' وہ سسک پڑی۔

''کیا بک رہی ہو؟ تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔'' اچانک منصور غصے سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ چپ رہیے اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے دانیال کو چھڑانے کا۔''

آمنہ رو پڑی اور اس کے سر کی چادر پھسل کر کندھوں پہ آ پڑی بھاری بھر کم آدمی اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور آمنہ کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''... آمنہ آفریدی! تم؟...'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ منصور حیران نظروں سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا، اس شخص نے سر سے شیشوں کے کام والی ٹوپی اور آنکھوں پر سے سیاہ چشمہ اتارا اور بولا... ''اب پہچانو''

''... شہریار سید! تم...'' آمنہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے وہ بے دم سی ہو کر کرسی پہ گر پڑی۔ اس کے سامنے یونیورسٹی کا ساتھی شہریار کھڑا تھا جو یونین کا صدر بھی تھا اور آمنہ کو پسند بھی کرتا تھا۔ آمنہ خود بھی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی اور الیکشن کے زمانے میں شہریار اور اس کے پینل کی بھرپور کنویسنگ کرتی تھی، ایک بار اس کی پولنگ ایجنٹ بھی بنی تھی، الیکشن جیتنے کے بعد شہریار نے اسے پروپوز بھی کیا تھا لیکن منصور کے بارے میں جان کر وہ خود ہی پیچھے ہٹ گیا تھا اور کچھ عرصے بعد قومی اسمبلی کے ممبر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی اور آج ایک نہایت ہولناک روپ میں اس کے سامنے تھا، منصور کے اندر کے روایتی شکی مرد نے سر ابھارا ''یہ دونوں ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہیں...؟ آمنہ نے تو کبھی اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔'' اس نے سوچا۔

''کمدار بچے کو لے کر آ'' اسی شخص نے دروازے پہ کھڑے شخص سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کمدار دانیال کو لے کر آیا۔ وہ ماں کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کی آغوش میں جا چھپا۔ ملازم دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟ شہریار؟ تم تو مشاعروں اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ سرمایہ دار ہونے کے باوجود سرمایہ داری کے خلاف تھے، غریبوں کے حقوق کی باتیں کرتے تھے۔ استحصال کے خلاف تھے، معاشرے میں دولت کی مساویانہ تقسیم کے قائل تھے، تم تو بڑی خوبصورت باتیں

کرتے تھے، لوگ تمہیں پسند کرتے تھے، ہم سب تمہیں پسند کرتے تھے، تم جب اپنی تقریروں میں ساحر لدھیانوی اور فیض کے اشعار Quote کرتے تھے تو مجمع تالیوں سے گونج اٹھتا تھا!... لیکن یہ سب؟'' آمنہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

''جانے دو سب کچھ اور بھول جاؤ کہ کبھی مجھ سے ملی تھیں! اس لیے نہیں کہ میری بدنامی ہوگی، بلکہ اس لیے کہ تمہیں اور تمہارے خاندان کو مشکل پیش آسکتی ہے... اغواء کرنے کے بعد بغیر تاوان لیے چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے سپاری لے کر قتل نہ کرنا۔''

شہریار نے کہا، اور اٹھ کر اپنے کاندھے پہ پڑی چادر کو آمنہ کے سر پر ڈال دیا اور آگے بڑھ کر منصور کو گلے لگالیا اور بولا

''جاؤ.. خدا تم دونوں کو سدا خوش رکھے۔''

''لیکن شہریار خدا کے لیے اتنا تو بتا دو کہ وہ سچ تھا جو میں نے کھلی آنکھوں سے یونیورسٹی میں دیکھا تھا!... یا یہ سچ ہے جو میں اپنی حیران آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔'' آمنہ نے دکھ سے پوچھا۔

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا آمنہ... جو تم آج دیکھ رہی ہو وہی سچ ہے اور سچ تھا!... باقی سب دھوکا تھا۔شہریار نے گہرے لہجے میں کہا۔

آمنہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، اسے اس شہر سے اور اس ملک کے سسٹم سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی، جہاں بھیڑیے، بھیڑوں کی کھالیں پہنے آزادانہ گھوم رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اس آسیب زدہ شہر میں آکر اچھا نہیں کیا، وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی روز کوئی اور سفاک سچائی سامنے آکر کھڑی ہو جائے۔

✠✠✠✠✠✠✠

نام: رئیس فاطمہ

تصانیف (۱) ''گلاب زخموں کے'' (افسانے)

(۲) ''موسم اداسیوں کے'' (۲ ناولٹ)

(۳) ''شاخِ نہالِ غم'' (افسانے)

(۴) ''آدھا آسمان'' (افسانے)

(۵) ''آئینوں کے درمیاں'' (منتخب کالموں کا مجموعہ)